شیرازہ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز
سری نگر، کشمیر

ماہنامہ

شیرازہ

جلد: ۲۴ — شمارہ: ۲

نگران و مُدیر اعلیٰ

محمد یوسف ٹینگ

ایڈیٹر

محمد احمد اندرابی

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر

ناشر، سیکرٹری جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر

مطبوعہ، فوٹو لیتھو ورکس دہلی۔

کتابت: غلام نبی کول

شرح چندہ:- سالانہ — ۲۰ روپے

فی کاپی — ۲ روپے

شیرازہ میں شائع شدہ مضامین میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی یا ادارے کا "کُلاً" یا "جُزواً" متفق ہونا ضروری نہیں۔

خط و کتابت کا پتہ:-

ایڈیٹر "شیرازہ" (اردو)۔

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز

لال منڈی۔ سرینگر

○ سرورق

جی۔ احمد

ترتیب

حرفِ آغاز	محمد احمد اندرابی
جوشؔ کے شاعرانہ مزاج کا پسِ منظر	سرنار احمد ۵
شاہمیری دور میں کشمیر پر وسط ایشیائی اثرات	محمد امین رفیقی ۱۴
غزلیں	مخمور سعیدی ۲۱، جگن ناتھ آزاد ۲۳، راج نرائن رازؔ ۲۴، میکشؔ کاشمیری ۲۵
آزاد غزل کے ساتھ مخالفین کا رویہ	یوسف جمال ۲۷
طنز و مزاح کے جھروکے سے	ایم۔عالم ۴۸
غزلیں	امیر قزلباش ۵۶، حیاتؔ لکھنوی ۵۸، سیدہ شانِ معراج ۵۹، مظفر ایرج ۶۱، بلراج کمار ۶۲
دریچہ زندگی ہے (نظم)	محمد یٰسین بیگ ۶۳
سیڑھی (افسانہ)	او۔پی شرما سارتھی ۶۴
گوہتیہ (افسانہ)	محمد بشیر مالیرکوٹلوی ۷۲
میری نظر میں (کتابوں پر تبصرہ)	موتی لال ساقیؔ ۷۴
اکادمی کی سرگرمیاں	ادارہ ۷۸

حرفِ آغاز

اس سال بھی یومِ جمہوریہ تقریبات کے دوران اکیڈمی کے زیرِ اہتمام ۲۸ جنوری کو ابھنو تھیٹر جموں میں ایک کل ہند اردو مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں ملک کے مختلف حصّوں سے تعلق رکھنے والے شعراء کے علاوہ جموں و کشمیر کے چند نامور شعراء نے بھی شرکت کی۔ کئی اور شعراء نے اگرچہ اس مشاعرے میں شرکت کی حامی بھری تھی لیکن وہ اس روز جموں نہیں آسکے۔ پھر بھی مشاعرہ بحیثیت مجموعی اچھا رہا۔ اس مشاعرے میں پڑھی گئی تخلیقات اسی شمارے میں شامل کی گئی ہیں۔ مشاعرے سے متعلق تفصیلی رپورٹ آپ کو "اکادمی کی سرگرمیاں" کے تحت پڑھنے کو ملے گی۔

○

جوشؔ صاحب کی تیسری برسی کے موقعہ پر اُن کے شاعرانہ مزاج کے پس منظر کے سلسلے میں سردار احمد کا ایک مضمون اُن کی یاد میں شاملِ اشاعت کیا گیا ہے۔

○

۲۰ اور ۲۱ جنوری کی درمیانی رات کو طویل علالت کے بعد پروفیسر محمد مجیب دہلی میں انتقال کر گئے۔ اُن کا شمار برِصغیر کے گنے چُنے نامور اور نمایندہ دانش وروں، عالموں اور ماہرینِ تعلیم میں ہوتا تھا۔

مجیب صاحب کی تصانیف میں کشمیر کی مشہور شاعرہ اور ملکہ حبہ خاتون پر لکھا گیا ایک ڈرامہ بھی شامل ہے جس کے لئے انہیں شاعرِ کشمیر مہجور نے مواد فراہم کیا تھا جس کا ذکر مہجور کی ذاتی ڈائریوں میں بھی ملتا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے اس دانش گاہ کی بھرپور اور ہمہ جہت ترقی کے لئے جو کام انہوں نے کیا، اسے بہت دیر تک یاد کیا جاتا رہے گا۔

پدم بھوشن کا اعزاز اُن کی جامع الصفات اور ہمہ جہت شخصیت کے شایانِ شان تھا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی رُوح کو سکون اور ان کے تعلق داروں کو صبرِ جمیل عطا کرے (آمین)

—— محمد احمد اندرابی

سردار احمد

جوشؔ کے شاعرانہ مزاج کا پس منظر

۲۲ فروری سنہ ۱۹۸۲ء کو جوشؔ صاحب ہم سب سے چھیاسی برس کی عمر میں رخصت ہو گئے۔ اُن کی شخصیت کی عظمت و دلآویزی اور اُن کے فکر و فن کی حقیقت اور توانائی کو سمجھنے، پرکھنے اور پہچاننے کے لئے اس تہذیب و تمدن، خاندان و ماحول اور زبان و کلچر کا بھرپور جائزہ لینا پڑے گا جس کے طاقِ زریں کے وہ آخری چراغ تھے۔

سنہ ۱۸۹۶ء میں جوشؔ آفریدی پٹھانوں کے ایسے خاندان میں بمقام ملیح آباد پیدا ہوئے جو اپنی جنگجوئی، جوانمردی، شعلہ مزاجی اور سریع الاشتعالی کے ساتھ قبائلی علاقوں کی بربریت اور وحشت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھا، جہاں آئے دن ذرا ذرا سی بات پر فوجداری اور خونخواری ہوا کرتی تھی اور سرِ بازار کمزوری اور غریبوں کی عزت لٹا کرتی تھی۔ خود جوشؔ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں رقم طراز ہیں کہ:۔

"ہندوستان آکر یہی اور جوارِ لکھنؤ میں رہنے کے باوصف ہم (پٹھانوں) نے اپنی جنگجوئی کی عادت نہیں چھوڑی ...... اور فرنگیوں نے آکر جب تلوار چھین لی تو لٹھ یونگا ہونے لگا"۔

(یادوں کی برات صفحہ ۱۶ ۔ ہندوستان ایڈیشن لکھنؤ)

"..... مدتوں تک ہمارا یہ عالم رہا کہ اگر کسی راہرو کو اتفاقاً کھانسی

آجاتی تھی اور نہ کسی کے دروازے کے سامنے تھوک دیتا تھا تو صاحب خانہ صاحب لٹھ لے کر گلی میں آجاتے تھے کہ خان صاحب آپ ہمارے مکان میں تھوک رہے ہیں اور تھوک دینے والے خان صاحب اکڑ کر یہ جواب دیتے تھے کہ جب نہیں تھوکا تھا تو اب تھوک رہے ہیں۔ آخ تھو، آخ تھو، اور دونوں کے درمیان بڑے زور شور سے لٹھ چلنے لگتا تھا۔"

(یادوں کی برات صفحہ ۱۶)

یہیں جوش کی شخصیت میں غیض و غضب، بد مزاجی، چڑچڑے پن اور جذباتی بے اعتدالی کا سراغ آسانی سے مل جاتا ہے۔ چند واقعات خود انہیں کی زبانی ملاحظہ فرمایئے۔

"میرا غیض و غضب کا یہ عالم تھا کہ ساتھ کھیلنے والے بچوں سے اگر کسی بات پر بگڑ جاتا تو بید مار مار کر ان بےچاروں کی کھال کھینچ لیا کرتا تھا۔"

"اپنی چھوٹی بہن انیس جہاں سے تو میرے ایسے ایسے زبردست ہنگامے ہوا کرتے تھے کہ اللہ کی پناہ۔ وہ بھی بچپن میں میری ہی طرح اس قدر بد مزاج، زود غضب اور چڑچڑی تھی کہ ہنگام جنگ میں وہ میرا گریبان پکڑ کر چاک کر دیتی اور میں اس کے جھونٹے نوچ کر پھینک دیا کرتا تھا۔"

"میری ماں، اپنے تمام بچوں میں سب سے زیادہ مجھ کو چاہتی تھیں اور دودھ اور شہد کا پیالہ روز صبح کو مجھے اپنے ہاتھ سے پلایا کرتی تھیں اور اگر کسی دن دودھ کے پیالے میں کوئی ذرہ نظر آجاتا تھا تو میں کم بخت پیالے کو تڑ سے زمین پر ٹپک دیا کرتا تھا اور وہ رونے لگتی تھیں۔"

"میں اپنے باپ سے بےحد ڈرتا تھا اور وہ اس قدر کہ جب ان کے سامنے جاتا تھا تو میری چال بدل جایا کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود، جب

ایک روز میں خربزے کی قاشیں چاقو کی نوک سے اٹھا اٹھا کر کھا رہا تھا اور انہوں نے ڈانٹ کر کہا تھا کہ یہ کیا ہے گدھے، چاقو کی نوک اگر تالو میں چبھ گئی تو ناچتا پھرے گا سارے گھر میں۔ تو مجھے اس قدر غصہ آ گیا تھا کہ میں نے باپ کی طرف چاقو اس طرح نشانہ باندھ کر پھینک مارا تھا کہ اگر وہ ان کے سینے میں چبھ جاتا تو لہولہان ہو جاتے"۔

(یادوں کی برات صفحہ ۱۹)

"ایک روز میں اپنے پھاٹک پر بڑی اسی ہوائی بندوق بھرے کھڑا تھا کہ ایک نائی کا لڑکا میرے سامنے سے گزرا لیکن مجھے سلام نہیں کیا۔ اس کی اس گستاخی پر مجھے تاؤ آ گیا۔ میں نے اس پر دن سے فائر کر دیا۔ بڑا سا چھرا اس بیچارے کی پیٹ میں پیوست ہو گیا اور وہ گر کر تڑپنے لگا اور مجھ شقی نے اس کے تڑپنے پر رحم کھانے کے عوض اس کی پسلی پر زور سے ٹھوکر مار کر کہا: اے زود کوڑھی کے نائی اٹھ، اور سلام کر، اور جب وہ غریب کراہتا اٹھا اور جھک کر مجھے سلام کیا، تو میرا غصہ ٹھنڈا ہو گیا"۔

یہ خاندان طوائفوں کے مجروں، ڈومنیوں کے گانوں اور جنسی لذتوں کے لئے بھی کچھ کم مشہور نہ تھا۔ جوشؔ کے دادا نواب محمد احمد خاں بہادر صاحب "مخزن آلام" تعلقہ دار کسمنڈی کے تیس [۳۰] بیویاں، چار نکاحی اور باقی سب لونڈیاں باندیاں تھیں اور ان کے ایک سو بارہ [۱۱۲] اولادیں تھیں۔ لیفٹیننٹ گورنر نے ان کو آنریری مجسٹریٹ کا منصب بھی عطا کیا تھا۔ اپنے انہیں دادا کے بارے میں جوشؔ نے لکھا ہے:-

ان کا انتقال اٹھاسی برس کی عمر میں ہوا۔ انہوں نے بلوغ کے

بعد سے انتقال تک کبھی ایک رات بھی عورت کے بغیر نہیں گذاری
البتہ جب لکھنؤ جاتے تو پردے کی شدت کی بناء پر چوں کہ بیویاں
کیسی، لونڈیاں باندیاں بھی ان کے ساتھ نہیں جا سکتی تھیں اور چونکہ
طوائفوں سے وہ سخت نفرت کرتے تھے اس لئے دو ایک راتیں
ناغہ ہو جاتی تھیں"۔

(یادوں کی برات صفحہ ۲۹۷)

جوش کے والد ماجد نواب بشیر احمد خان بشیر مردانہ حسن کے پیکر، علم و فضل
کے مالک اور نظیری، قاآنی اور فردوسی کے کلام کے حافظ تھے۔ صاحب دیوان
شاعر تھے۔ اپنے والد ماجد کا ذکر کرتے ہوئے جوش نے تحریر کیا ہے:۔

"قلب کی گداختگی، شاعری کی شیفتگی اور علم و فضل سے وابستگی
اور لکھنؤ کی تہذیب سے دلدادگی کے باوصف ان کے مزاج میں اس
قدر غصہ تھا کہ غضب کے ہنگام وہ ایک خوفناک پٹھان کے علاوہ اور کچھ
بھی نظر نہیں آتے تھے اور "قبضے پر ہاتھ رکھتے ہی کچھ اور ہو گئے" کا
عالم ان پر طاری ہو جایا کرتا تھا"۔

(یادوں کی برات صفحہ نمبر ۲۷۵)

جوش نے اپنے چچا کے حال میں جہاں ان کے اجڈ پن، ان کی جہالت اور ان
کے زبردست غصہ کی بابت لکھا ہے، وہاں ان کے بے تحاشا گالیاں بکنے کا حال
بھی درج کیا ہے۔

(یادوں کی برات صفحہ ۲۸۳ اور اس کے آگے بھی)

جوش کی ماں نواب خواجہ محمد خان دھولپور (راجپوتانہ) کی چہیتی بیٹی تھیں۔
جن کی تعلیم و تربیت کے لئے لکھنؤ سے ایک قابل استانی بلائی گئی تھیں اور لکھنؤ

کی مغلانیاں آداب سکھانے کے لئے مامور کی گئی تھیں۔ لکھنوی اثر ہی کی وجہ سے جوشؔ کے ماموں بالکل شیعہ ہو گئے تھے۔ لیکن والدۂ ماجدہ اصحابِ ثلاثہ کو ماننے کے باوجود حضرت علیؓ کو ترجیحی درجہ دیتی تھیں اور محرم میں عزاداری کرتی تھیں۔ جوشؔ کے نانا نے اپنی بیٹی کو جہیز مال گاڑی کی آٹھ بڑی کراچیوں میں بھر کر ملیح آباد بھجوایا اور ساتھ میں دو مغلانیاں، دو غلام اور ایک ہاتھی بھی سونے چاندی کے زیورات کے ساتھ جہیز میں دیا تھا۔ بارات آگرہ میں دو ماہ قیام پذیر رہی۔ ملیح آباد میں بارات کی واپسی پر عرصہ تک دعوتیں اور طوائفوں کے مجروں کا سلسلہ جاری رہا۔ جوشؔ کا بیان ہے کہ ان کی والدہ ماجدہ انہیں اپنی سات اولادوں میں سب سے زیادہ چاہتی تھیں اور انہیں اپنے ہاتھ سے دودھ، شہد اور جلیبیاں روزانہ ناشتہ میں کھلاتی تھیں اور پیار سے "ننھے" کہا کرتی تھیں۔ وہ نرم مزاج اور سنجیدہ خاتون تھیں۔ جب سسرال میں آئے دن چاقو، تلوار اور گالی گلوچ کا ہنگامہ دیکھا تو اتنی گھبرائیں کہ الگ مکان تعمیر کرا کر رہنا شروع کیا۔ جوشؔ کی دادی جان بھی آگرہ کے ممتاز اور متمول گھرانہ کی تھیں اور بقول جوشؔ "انہیں ہزاروں کہاوتیں اور فارسی اردو کے ہزاروں اشعار یاد تھے جنہیں وہ برمحل صرف کیا کرتی تھیں۔ .... اور جب ہم میں سے کوئی غلط لفظ بول اٹھتا تو وہ منہ پر تھپڑ مار دیا کرتی تھیں۔"

یہ خاندان، مرزا غالب کا قرابت دار بھی تھا۔"

(یادوں کی برات صفحہ ۲۸۱)

جوشؔ نے اپنے کو مجموعہ اضداد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں بچپن میں کیا تھا؟ شعلہ تھا کہ شبنم۔ حد یہ تھا کہ حریر، اوک خار تھا کہ برگِ گل، خنجر تھا کہ ہلال، چنگیز خان کا علمبردار تھا کہ رحمت اللعالمینؐ کا پرستار۔" جوشؔ نے اپنے بچپن اور لڑکپن کے ان واقعات کی بھی تفصیل پیش کی

ہے جس سے ان کے لطف و عطا اور مہر و وفا کی بھی فطرت کا اندازہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی حدیدیت و حریریت، شعلہ افشانی و شعلہ چکانی کے امتزاج کے ساتھ ساتھ آب و آتش بہم آمیختہ از لب و لعل کا انوکھا پن بھی ملتا ہے۔

جاگیردارانہ اور رئیسانہ ٹھاٹھ باٹ کا ماحول و دولت، فراغت اور عیش و عشرت کی طلسمی فضا جس میں جوش پروان چڑھ رہے تھے ان کی حویلی کے اندر اور باہر چھائی ہوئی تھی۔ بقول جوش "ہر طرف رنگینی تھی، رنگینی تھی، چہل پہل تھی۔ لونڈیاں، باندیاں، مامائیں، اصیلیں، مغلانیاں، انائیں، دوائیاں، کھلائیاں — استانیاں، پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے والیاں اور راتوں کو کہانیاں سنانے والیاں، چاروں طرف چلتی پھرتی اور ہنستی بولتی نظر آتی تھیں۔ اس کے علاوہ شریف گھرانوں کی غریب عورتیں بھی چندے اچھے دن گزارنے کے لئے آئے دن بطور مہمان آتیں۔ ایک ایک دو دو ماہ رہ کر واپس ہوتیں۔ حویلی کے باہر خدمت گاروں، رکاب داروں، مراثیوں، سپاہیوں، مولویوں، ماسٹروں، مصاحبوں، داستان گویوں، منشیوں، عملداروں اور کارندوں کا ہر طرف ایک ہنگامہ سا برپا رہتا اور ان کے علاوہ بیرونی و لکھنوی شاعروں میں سے ہمیشہ دو چار بطور مہمان رہتے اور آئے دن مشاعرے ہوا کرتے تھے۔

جوش کے معلمین میں فارسی، انگریزی، عربی اور اُردو کی تعلیم دینے والے مولوی نیاز علی خان، گومتی پرشاد، مولانا قدرت اللہ بیگ اور مولانا طاہر تھے جو اپنے اپنے مضامین کے ماہر، نکتہ سنج اور نکتہ رس اور بے پناہ ذخیرۂ الفاظ کے مالک تھے۔ ان سب کے ساتھ حسنِ فطرت کی رنگینیوں نے بھی ایک عظیم استاد کا کام انجام دیا جس کا ذکر جوش نے بار بار کیا ہے ؎

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کیلئے   اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

نو برس کی عمر میں جب جوش کو شاعری کرتے ہوئے "پکڑا" گیا تو ان کے والد ماجد نے اپنی تمام توانائیں اپنے بیٹے کو شاعری کرنے سے باز رکھنے میں صرف کر دیں لیکن، بقول جوش وہ بچہ جس کا باپ بھی شاعر ہو، دادا بھی شاعر ہو، دو سوتیلے چچا بھی شاعر ہوں، بڑی پھوپھی، بڑی بہن اور بڑا بھائی بھی، جس کا حقیقی ماموں بھی شاعر ہو، جس کی دادی مرزا غالب کی قرابت دار ہو اور اردو فارسی کے اشعار برمحل سناتی رہی ہو جس کی انا خالص لکھنوی ہو اور رات کے وقت "کھلتی ہے کنج قفس میں مری زبان صیاد" کی لوری دے دے کر اس بچہ کو سلاتی ہے، جس کے گھر میں آئے دن لکھنو کے شاعر آتے جاتے اور تیسرے چوتھے مہینے مشاعرے ہوتے رہتے ہوں اور جو شعرا کے دیوانوں کو پتنگ اور گولیوں کی طرح کھیل کر پروان چڑھا ہو، وہ شعر نہیں کہے گا تو اور کیا کہے گا۔

ایک بار جب جوش کی وہ صندوقچی ان کے باپ کے ہاتھ لگ گئی جس میں شعر کہہ کہہ کر پرزے جمع کیے گئے تھے تو انہوں نے پرزوں کو پھاڑ پھاڑ کر پھینکنا شروع کر دیا۔ اپنے سرمایہ شعری کا یہ انجام دیکھ کر شبیر حسن (جوش) بے ہوش ہو گئے۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ دوا دی گئی۔ ہوش میں لایا گیا اور تب باپ نے شعر گوئی کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی کہ باپ خود اصلاح دیا کریں گے۔ بیٹے کے استاد بننے کے بعد انہوں نے پہلا امتحان لیتے ہوئے اس شعر کے معنی دریافت کیئے۔

وہ جلد آئیں گے یا دیر میں شبِ وعدہ
میں گل بچھاؤں کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر

صاحبزادے شبیر میاں (شبیر حسن جوش) بولے "میاں یہ شعر بہت آسان ہے۔ اس کے دوست نے وعدہ کیا ہے کہ آج میں آؤں گا" اب شاعر اس ششو پنج

ہیں ہے کہ میں گُل بچھاؤں کہ کلیاں۔ اگر وہ ٹھیک وقت پر آنے والا ہے تو میں کھلے ہوئے پھول اور اگر دیر میں آنے والا ہے تو میں کھلی کلیاں بچھاؤں گا۔"

جوشؔ کے والد ماجد نے اس مطلب میں پہلی غلطی تو یہ بتائی کہ "کھلے ہوئے پھول کہنا غلط ہے کیوں کہ کلی جب چٹک جاتی ہے تو اس کو پھول کہا جاتا ہے۔ کھلاوٹ تو پھول کی عین ذات ہے اس لئے کھلے ہوئے پھول کہنا حشو و زوائد میں داخل ہے' اور دوسری غلطی یہ ہے کہ بچے (جوشؔ) نے کلی کے متعلق "بے کھلی کلیاں" کہا ہے۔ حالاں کہ کلی کو تو اس لئے کلی کہتے ہیں کہ وہ ہنوز چٹک کر کھلی نہیں ہے اور بے کھلا پن اس کی عین ذات ہے اس لئے بے کھلی کلیاں کہنا صرف اسراف الفاظ ہی نہیں ایک مہمل سی بات ہے۔

زبان و ادب کی تاریخ میں ایک عجیب اور قابل ذکر واقعہ جوشؔ کے گھر ہی میں سامنے آیا جسے جاں نثار اختر نے "ہزاروں باتیں" کے تحت (اردو بلٹز ۱۶ جنوری ۱۹۷۱ء) درج کیا ہے کہ "ایک دن جوشؔ صاحب کہنے لگے' ہمارے باپ دادا کو چھوڑ کر خاندان کے سبھی افراد تقریباً اُجڈ اور ان پڑھ تھے۔ ہماری بڑی بہن کی شادی بھی خاندان کے ایسے ہی ایک فرد سے ہوئی تھی۔ شادی کے دوسرے دن بہن گھر آئی تو اس نے ہمارے باپ سے کہا "وہ" شعر میں اضافت کھا جاتے ہیں۔

یہ سن کر انہیں بڑا طیش آیا۔ داماد کو بلوا بھیجا۔ ایک شعر جس میں کئی اضافتیں تھیں لکھ کر دیا اور کہا "پڑھ کر سناؤ"۔ اس نے شعر پڑھا تو اضافتیں کھا گیا۔ انہوں نے ایک کورا کاغذ سامنے بڑھایا اور کہا "طلاق لکھ دو"۔ تم شعر میں اضافتیں کھا جاتے ہو۔ میری بیٹی کا تم سے نباہ نہیں ہو سکتا'۔ اشارہ پاتے ہی چھ لٹھ بند پیچھے آکر کھڑے ہو گئے۔ مفر کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو داماد بیچارے نے چپ چاپ طلاق لکھ دی۔ جوشؔ کہنے لگے ہمارے گھر میں زبان و ادب کے سلسلے میں

اتنی لغزش بھی برداشت نہ کی جاتی تھی۔ اگر یہ واقعہ غلط بھی ثابت ہو جائے تب بھی یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ خدانخواستہ اگر یہ واقعہ ظہور میں آتا تو وہ جوشؔ ہی کا گھر ہوتا جہاں زبان و بیان کا اہتمام جزوِ زندگی تھا۔

لذتِ گفتاری، شعری حسن کاری، قادر الکلامی اور حسن پرستی کی یہی بے پناہ قوت اور خصوصیت جوشؔ کے شاعرانہ مزاج میں رچ بس کر ہمیشہ ایک جاندار اور مضبوط پسِ منظر کا کام کرتی رہی —— ہ

○

شیرازہ میں چھپنے والی نگارشات

- ہر نگارش کا معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو۔
- ہندوستانی تاریخ و تمدن اور ثقافت و ادب کے مختلف پہلوؤں پر معیاری و تحقیقی مضامین قبول کئے جاتے ہیں۔
- ریاست کے تمدنی اور فنی ورثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات ترجیحی طور پر شائع کئے جاتے ہیں۔
- فنِ تعمیر، آرٹ اور مصوری سے متعلق مضامین کے ساتھ آنے والی نادر تصاویر کا الگ سے معاوضہ دیا جا سکتا ہے۔

○

محمد امین رفیقی

شاہمیری دور میں کشمیر پر وسط ایشیائی اثرات

کشمیر اور وسط ایشیا کے تعلقات از منۂ قدیم سے تھے کیونکہ بدھ دورِ حکومت میں کشمیر کا تبت اور دیگر ملحقہ علاقہ جات کے ساتھ مذہبی رابطہ تھا۔ بدھ بھکشو اسی علاقہ سے یہاں آتے تھے۔ یہاں کی بدھ خانقاہیں اسی طرز کی تھیں جس طرز پر تبت اور دیگر وسط ایشیائی علاقہ جات میں بنی تھیں۔ بدھ بادشاہ رینچن شاہ کے دورِ حکومت میں وسط ایشیا اور کشمیر کا رابطہ مستقل صورت اختیار کر گیا جبکہ شمال مشرقی جانب لداخ کے راستہ سے حضرت سید شرف الدین عبدالرحمان المعلب بہ بلبل صاحب رح بغرض اشاعت دینِ مبین اسلام ترکستان سے یہاں تشریف لائے۔ یہاں کے حکمران رینچن شاہ کو مشرف بہ اسلام کر کے سلطان صدرالدین کے معزز نام سے نوازا۔ مصنف باغ سلیمان سعداللہ شاہ آبادی نے اس واقعہ کا تذکرہ نہایت ہی لطیف پیرایہ میں یوں کیا ہے ؎

دیدہ شخصے چو سرو بر لب جو | عاشقش صبح و آفتابش رو
خرقہ پوشیدہ ہمچو خوش حالاں | خواندہ قرآں چو بلبل نالاں

اسی واقعہ کو مرحوم منشی محمد دین فوقؔ نے یوں بیان کیا ہے ؎

بلبل اسلام جب آیا تیرے گلزار میں | اے گلِ کشمیر کیا وہ دن وہ ساعت یاد ہے
دیکھنا شاہی محل سے راجہ ذی جاہ کا | گھر بلا کر پھر اسے دینا وہ دعوت یاد ہے
کلمۂ توحید پڑھ لینا وہ دل کے شوق سے | اور اس کے ہاتھ پر کرنا وہ بیعت یاد ہے

جنت ارضی میں اول تو ہی نو مسلم ہوا
رفتہ رفتہ پھر ہوئی تیری رعیت یادہ ہے

حضرت بلبل صاحبؒ ترکستان کے موسوی سادات میں سے تھے۔ بہت عرصہ بغداد میں رہنے کے بعد آپ شاہ نعمت اللہ ولی فارسیؒ کے مرید ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب حضرت شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید تھے اور حنفیہ مسلک کے پیرو تھے۔ کشمیر میں سلسلہ سہروردیہ اور مسلک امام اعظمؒ کے بانی حضرت بلبل صاحبؒ ہی تھے۔ بلبل صاحب ایک قلندر وضع و آزاد طبیعت بزرگ تھے۔ ان کے ہمراہ ان کے بہت سے خلفاء بھی تھے جن میں ملا احمد علامہ اول بھی شامل تھے۔ بلبل صاحب کے روضہ میں ان کی تربت کے ساتھ ایک اور قبر ہے۔ آج تک یہی قبر ملا احمد علامہ کی خیال کی جاتی تھی۔ بوقت مرمت روضہ بلبل صاحبؒ راقم نے اندر جاکر اس قبر کا بغور مشاہدہ و مطالعہ کیا۔ قبر پر یہ عبارت درج ہے: "فی تاریخ یوم الاحد ثامن عشر ربیع الاول سنہ ثلثین و ثمانمایۃ" اتوار ۱۸ ماہ ربیع الاول ۸۳۰ھ، سامنے یعنی جنوبی طرف یہ عبارت درج ہے: ھذا القبر لعامی محمد بخیدین" جو کہ صاف نہیں پڑھی جاتی ہے یہ قبر چونکہ سنہ ۸۳۰ھ کی ہے اس لئے یہ صاف عیاں ہے کہ یہ قبر ملا احمد علامہ اول کی نہیں ہے۔ یا قبر پر جو پتھر نصب ہے وہ کسی اور قبر کا لاکر اس جگہ نصب کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ حضرت بلبل صاحبؒ کے ساتھ یہاں آئے انہوں نے یہاں ہی سکونت اختیار کی۔ اس سے تاریخ کشمیر میں مسلم دور کی ابتدا ہوئی اور ایک اہم باب کا اضافہ ہوا۔

اس کے بعد سلطان علاؤالدین کے وقت میں آٹھویں صدی ہجری کے دوسرے نصف میں حضرت[۲] جلال الدین مخدوم جہانیاں جہانگشت قدس اللہ سرہ بغرض سیر و سیاحت اپنے خلفاؤ کی ایک جماعت کے ہمراہ یہاں تشریف لائے اور کچھ ہی عرصے قیام کے بعد واپس چلے گئے۔

۱۔ کشمیر جلد اول از جی ایم ڈی صوفی مطبوعہ لاہور۔
۲۔ تاریخ حسن جلد دوم مطبوعہ محکمہ ریسرچ و پبلیکیشن سری نگر۔

حضرت بلبل صاحبؒ کے قریباً ۴۰ سال بعد حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی قدس اللہ سرہٗ علاقہ ہمدان سے سادات، علماء و فضلاء کی ایک کثیر جماعت کے ہمراہ بارہمولہ کے راستہ بغرض اشاعت اسلام وارد کشمیر ہوئے۔ حضرت امیرؒ سلسلۂ کبرویہ اور مسلک شافعیؒ کے پیرو تھے۔ چونکہ حضرت امیر کبیرؒ کا مشن خلوص اور زمین مبین کی بے لوث خدمت پر مبنی تھا اس لئے انہوں نے شافعی مسلک کے بجائے بلبل صاحبؒ کے مسلک حنفیہ کی پیروی کو ہی ترجیح دی۔ حضرت امیرؒ کے یہاں آنے سے کشمیر کے تہذیب و تمدن پر وسط ایشیاء کی مکمل چھاپ پڑی۔ کیونکہ جو لوگ حضرت امیرؒ کے ہمرکاب تھے وہ اکثر وسط ایشیا کے علاقہ جات، تبت، یارقند، خوارزم، سمرقند، بلخ، بخارا، ترکستان، بیہق، خراسان اور ہمورستان وغیرہ علاقوں کے باشندے تھے اور یہاں آکر انہوں نے مستقل طور سکونت اختیار کی اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ رشتے جوڑ لئے۔

حضرت امیرؒ تین دفعہ یہاں آئے۔ دوسری دفعہ وہ لداخ کے راستہ سے ترکستان سے ہوتے ہوئے واپس چلے گئے۔ ان کے ہمرکاب آئے ہوئے سادات و علماء حضرات امیرؒ کے مشن اور تبلیغی کام کو حتی الوسع چلاتے رہے اور ساتھ ساتھ سماجی اصلاح بھی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ یہاں کے لوگوں کے لباس میں نمایاں تبدیلی لائی گئی۔ یہاں کے لوگ تنگ پاجامہ اور تنگ کرتہ پہننے کے عادی تھے۔ حضرت امیرؒ کے کہنے پر کھلا پاجامہ اور ڈھیلا کرتہ پہننے لگے۔ ان کے بعد ان کے فرزند ارجمند حضرت میر محمد ہمدانی قدس اللہ سرہٗ وارد کشمیر ہوئے۔ یہ کم و بیش ۲۰ یا ۲۲ سال یہاں مقیم رہے۔ یہاں پر انہوں نے سلطان سکندر بت شکن کے وزیر ملک سیف الدین المعروف سہہ بھٹ کی بیٹی سے شادی کی۔ سلطان سکندر حضرت میر محمد ہمدانیؒ کا خاص معتمد تھا۔ سلطان نے حضرت امیرؒ کے صفہ پر ایک عالی شان خانقاہ تعمیر کرائی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تبت سے بدھ مت یہاں آیا اور عرصہ دراز تک بدھ مت کا اثر یہاں کی تہذیب و تمدن پر رہا۔ حالانکہ اس وقت بھی مسلم زیارتوں اور خانقاہوں میں بدھ طرز تعمیر کا اثر دکھائی دیتا ہے جس طرح بدھ وہاروں اور خانقاہوں کی چھتیں پگوڑہ طرز کی بنی ہوتی ہیں اسی طرح یہاں کی

خانقاہوں اور زیارتوں کی چھتیں بھی بنی ہوئی ہیں۔ گویا یہ وسط ایشیائی فن تعمیر کا اثر ہے جو اس وقت بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کے بعد میر محمد ہمدانیؒ کے کہنے پر سلطان سکندر نے جامع مسجد تعمیر کرائی۔ اس کی تعمیر میں سید محمد نور رستانی اور استاد خواجہ صدرالدین خراسانی معمار تھے۔ یہ دونوں اشخاص حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کے خاص خلفائیں میں شامل تھے اور انہی کے ہمرکاب یہاں آئے تھے۔ چونکہ جامع مسجد کئی بار نذرِ آتش ہوئی اسلئے اس کے طرزِ تعمیر میں تغیر و تبدل ایک لازمی امر ہے۔ اسی دوران سلطان سکندر کی میرا نامی چہیتی ملکہ فوت ہوگئی جو مہاسری کے خستہ و منہدم مندر میں دفنائی گئی۔ اور اس کے اوپر ایک شاندار پانچ گنبد والا مقبرہ تعمیر کرایا گیا۔ یہ تعمیر کشمیر میں وسط ایشیائی طرز کی پہلی تعمیر ہے۔ آج کل یہ جگہ ڈومٹ بڈشاہ کے نام سے مشہور ہے۔ تواریخ کشمیر میں اس مقبرہ کی تعمیر کا کہیں تذکرہ درج نہیں ہے۔ لیکن عمیق تواریخی مطالعہ کے بعد راقم الحروف کی یہ رائے ہے کہ سید محمد ہمدانیؒ کے سلطان سکندر سے قریبی تعلقات تھے اور سلطان سکندر حضرت میر محمد ہمدانیؒ کا سخت معتقد تھا اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حضرت میر محمد ہمدانیؒ کا دخل امور مملکت میں بھی تھا۔ ان حالات کے پیش نظر بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر حضرت میر محمد ہمدانیؒ نے ملکہ کا مقبرہ اسی طرز پر تعمیر کرایا جس طرز پر حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کا مقبرہ اس وقت کولاب میں ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر شمس الدین احمد صاحب (صدر شعبہ فارسی کشمیر یونیورسٹی) کولاب سے حضرت امیر کے مقبرہ کے جو فوٹو لائے ہیں، راقم کو بھی انہیں دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ فوٹو دیکھنے سے حضرت امیرؒ کے مقبرہ اور ملکہ سلطان سکندر کے مقبرہ میں معمولی فرق دکھائی دیتا ہے۔ چونکہ حضرت امیرؒ کا مقبرہ تقدس کی بنا پر محفوظ رہا ہے اور ملکہ سلطان سکندر کا مقبرہ وقتاً فوقتاً حوادثات زمانہ کا شکار ہوتا رہا ہے۔ کشمیر کے قدیم ہندو مناد جن میں مارتنڈ، اونتی پورہ، پائر، لدہ، پٹن، پانڈریٹھن اور گرو وغیرہ کے آثار اپنی آن بان کے ساتھ اس وقت بھی اپنی دیرینہ عظمت کی یاد دلاتے ہیں، صرف تراشیدہ پتھروں سے بنے ہوئے ہیں، ان میں کہیں پختہ اینٹوں کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ قدیم زمانہ میں مندر تعمیر کرتے ہیں اینٹوں کا استعمال یا تو عیب سمجھا جاتا تھا یا پھر پختہ اینٹوں کے

بنانے کا رواج ہی نہ تھا۔ اس صورت میں سلطان سکندر نے ملکہ کا پانچ گنبد والا مقبرہ مندر لو کی شری کے منہدم کھنڈرات کے تراشیدہ پتھروں کی بنیاد پر ہی تعمیر کرایا۔ اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ مقبرہ یہاں وسط ایشیائی طرز کا پہلا شاہکار ہے جو اس وقت بھی ہمارے زیر نظر ہے۔

اس کے بعد سلطان زین العابدین کے دور میں وسط ایشیا اور کشمیر کا رابطہ تجارتی لحاظ سے اور زیادہ مستحکم ہوا۔ وادی میں صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے لئے سلطان نے وسط ایشیا سے کاریگروں کو یہاں لایا اور انہیں مراعات دے کر مختلف صنعت و حرفت کے مراکز قائم کئے۔ چنانچہ کاغذ سازی کے لئے سلطان نے اپنے دارالخلافہ نوشہرہ میں ایک محلہ کاغذ سازوں کا بسایا' اور یہ محلہ اس وقت بھی کاغذ گر محلہ کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح جلد سازوں کا ایک اور محلہ جامع مسجد کی شمالی جانب آباد کیا۔ یہ محلہ اس وقت بھی جلد گر محلہ کے نام سے ہی مشہور ہے۔ اسی طرح یارقند، سمرقند، بخارا اور تبت سے جو جوہری اور حکاک یہاں آتے تھے ان کے لئے ایک مخصوص بازار آباد کیا تھا۔ یہ جگہ نوشہرہ کے قریب آج کل بھی لعل بازار کے نام سے ہی آباد ہے۔ اسی طرح قالین باف، صحاف، زین ساز، مہرکن وغیرہ یہاں لائے گئے اور وادی میں ان دستکاریوں کو سلطان نے حتی الوسع فروغ دیا۔ ملا عود[1] نامی ایک شخص خراسان سے یہاں لایا گیا۔ یہ شخص ماہر علم موسیقی تھا۔ ملا حافظ نامی دوسرا شخص حافظ و خوشخوان تھا۔ اسی طرح جبیو[2] نامی ایک اور کاریگر فن آتش بازی کا ماہر تھا۔ بادشاہ نے اس کو بھی یہاں لا کر شاہی نوازشات سے نوازا۔ غرض سلطان زین العابدین نے حتی الوسع یہاں کے باشندوں کو صنعت و حرفت سے آراستہ کرنے کے لئے سعی کی۔ ریشم کی صنعت بھی اسی سلطان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد اور بھی لوگ وقتاً فوقتاً یہاں آتے

---

[1] اس کا اصلی نام دریافت نہ ہو سکا چونکہ یہ عود بجانا جانتا تھا اس لئے اسی نام سے یہ تواریخوں میں درج ہے۔

[2] منشی محمد دین فوق نے تاریخ بڈشاہی میں اس کا نام حبیب میر لکھا ہے۔

رہے۔ نویں صدی ہجری کے آخر میں سلطان حسن شاہ کے وقت میں جناب میر شمس الدین محمد عراقی والیٔ خراسان کی جانب یہاں بطور سفیر آئے۔ حسن شاہ کی علالت کی وجہ سے میر موصوف قریباً سات سال یہاں رُکے رہے اور سلطان محمد شاہ کے وقت میں یہاں سے واپس چلے گئے۔ بعد میں سلطان فتح شاہ کے عہد میں دوبارہ بغرض اشاعت مسلک امامیہ یہاں آئے۔[1] جناب میر شمس الدین محمد عراقی قبائل شاہان صفویہ، جو کہ خراسان و عراق میں مشہور تھے اور شاہان گیعان" کے مُنہ بولے بیٹے تھے اسی نسبت سے ان کو "کے" کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ دراصل وہ موسوی سادات میں سے تھے۔ آپ کے والد کا نام درویش ابراہیم تھا اور آپ کی والدہ قزوین کی سیّدزادی تھی، اور یہ نوربخشی عقاید کے معتقد تھے۔ اہل تشیع کے بڑے عالم و فاضل ہونے کے علاوہ نہایت عقلمند اور اپنے وقت کے ایک بہت بڑے مدبر سیاستدان بھی تھے۔ چنانچہ شوکہ پنڈت نے راج ترنگنی میں اس کا تذکرہ کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

"عراق[2] دیش میں تمام علوم جاننے والا امیر شمس تھا جو کہ شاہ قاسم کا شاگرد تھا۔
اس نے اس سے بیعت نہیں کی تھی بلکہ بیعت کے بغیر ہی اس کا معتقد تھا۔
یہ شخص سب کا گرو تھا بلکہ خود کسی کا مرید نہ تھا۔"

میر موصوف نے تبلیغی کام کے ساتھ ساتھ سماجی کاموں میں بھی نمایاں کارنامے کئے۔ انہوں نے ہاری پربت کی شمالی جانب باغ بنوائے اور ان میں مختلف قسم کی سبزیاں کاشت کرائیں جن کے بیج انہوں نے وسط ایشیا کے علاقوں سے یہاں درآمد کئے۔ ان میں خربوزہ، کدو مشہدی، تربوزہ، انگور اور پستہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس کے بعد دسویں صدی ہجری کے اختتام پر مرزا حیدر دوغلات کا شغری لشکر کے ہمراہ وارد کشمیر ہوا۔ مرزا حیدر ایک زبردست فاتح اور حکمران ہونے کے علاوہ اعلیٰ

1۔ تحفۃ الاحباب مصنف نامعلوم مخطوطہ محکمہ ریسرچ۔
2۔ راج ترنگنی شوکہ پنڈت مرتبہ سری کنٹھ کول اشلوک ۲۴

درجہ کا مورخ بھی تھا۔ اس کی مشہور تصنیف "تاریخ رشیدی" ہے۔ اس نے یہاں کی صنعت و حرفت میں اور اضافہ کیا۔ مرزا نے سمرقند سے[1] ختم بند چھت اور پنجرہ کاری کے کاریگر اپنے ساتھ لائے تھے جنہوں نے اس فن کو یہاں فروغ دیا۔

ختم بند چھت لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو آپس میں ملا کر، گول، مربع، مستطیل مخمس اور مسدس وغیرہ شکلوں میں بنائی جاتی ہے اور پنجرہ کاری کی کھڑکیاں جو کہ اس وقت بھی قدیم عمارتوں اور خانقاہوں میں دیکھنے میں آتی ہیں، اسی حکمران کے وقت کی ایجاد کردہ ہیں۔ آج کل بھی اس کے کاریگر یہاں موجود ہیں ــــ ٥

---

[1] کشمیر از غلام محی الدین صوفی، مطبوعہ لاہور

منصور سعیدی

○

ادھوری قربتوں کے خواب آنکھوں کو دکھا جانا
ہزاروں دوریوں پر بھی ترا کچھ پاس آ جانا

اداسی کے دھندلکوں کا دماغ و دل پہ چھا جانا
نظر کے سامنے اک گم شدہ منظر کا آ جانا

سنی ہے میں نے اکثر بند دروازوں کی سرگوشی
صدائیں چاہتی ہیں سب کھلی سڑکوں پہ آ جانا

تعلق کی یہ منزل بھی ہماری راہ میں آئی
کسی کو ڈھونڈنا لیکن پتہ اپنا ہی پا جانا

نگاہ و دل کے رشتوں کو کہیں رسوا نہ کر دوں میں
بچھڑنا ہو تو چپ رہنے کا فن مجھ کو سکھا جانا

تری یادیں، کہ اس طوفانِ ظلمت میں بھی روشن ہیں
ہوا مشکل ہوا کو ان چراغوں کا بجھا جانا

سمجھتے تھے حسیں پرچھائیوں کا کیا بھروسا ہے
مگر ہم نے تری پرچھائیں کو تجھ سے جدا جانا

خلا میں ڈوبتی سی آہٹیں تھیں کچھ، جنہیں ہم نے
سفر میں ساتھ رکھا، منزلوں کا آسرا جانا

میں تیرے ساتھ ہوں، تو اس کی خوشبو کے تعاقب میں
جہاں تک جا سکے اے سر پھری موجِ ہوا، جانا

نظر اُس کی بھی اے مخمورؔ دھوکا کھا گئی آخر
وہی تھا آشنا چہرہ، جسے ناآشنا جانا

جگن ناتھ آزاد

کس فصل میں سرمست و غزل خواں نہ رہے ہم
شرمندۂ احسانِ بہاراں نہ رہے ہم

جب اپنا لہو صحنِ گلستاں میں رواں تھا
اُس وقت بھی دلگیر و پریشاں نہ رہے ہم

ایسا بھی کوئی دور ہے سائے خاکِ گلستاں
جس دور میں شایانِ بہاراں نہ رہے ہم

وہ کون سا ظلمات کا طوفاں تھا کہ جس میں
سوزندہ و درخشندہ و تاباں نہ رہے ہم

اے فصلِ خزاں کون وہ صحرا تھا کہ جس پر
گُل ریز و گل آثار و گل افشاں نہ رہے ہم

کب ہم نے تجلی کو نہ سینے سے لگایا
ظلمات سے کب دست و گریباں نہ رہے ہم

گو رونقِ ماحولِ شبستاں ہے ہمیں سے
آوارۂ ماحولِ شبستاں نہ رہے ہم

سینے میں بھی، دل میں بھی رہے چاک و لیکن
اے موسمِ گل! چاک گریباں نہ رہے ہم

تو رہ نہ سکی پھول میں اے پھول کی خوشبو
کانٹوں میں رہے اور پریشاں نہ رہے ہم

اے دوست! ترے غم کی اسیری کے تصدق
کس وقت اسیرِ غمِ دوراں نہ رہے ہم

مانا کہ رہا بند ہی قفلِ درِ دنیا
لیکن کبھی منت کشِ درباں نہ رہے ہم

بالا نہ ہوا گرچہ کبھی نرخ ہمارا
بازار میں لیکن کبھی ارزاں نہ رہے ہم

جلتے رہے ہم تند ہواؤں کے مقابل
آزاد! چراغِ تہِ داماں نہ رہے ہم

راج نرائن راز

○

موجِ انفاس کو روانی دے
رات کوئی تو داستانی دے

آنکھ منظر کُشا نہیں، پل پل
اپنے ہونے کی کچھ نشانی دے

نغمے، طائر، شجر، زمیں پیوست
تو انہیں موسمِ آسمانی دے

آٹھواں رنگ، جس کا عنواں ہے
ایسی تازہ، نئی کہانی دے

ہاتھ شل، پانی بے طرح ٹھہرا
کشتیاں دے تو بادبانی دے

کتنی گرمی لہو میں ہے، دیکھوں
مرحلہ کوئی امتحانی دے

میں جسے راز کہہ سکوں اپنا
کوئی ہمزاد، کوئی ثانی دے

یہ خرد کی ترکتازی، ہے ثبوت کم نگاہی
ہے دلیلِ عشق کامل، یہ جنوں کی بے پناہی

نہیں طالبِ زرِ عالم مری آہِ صبح گاہی
مرے پاؤں چومتی ہے، ہو قلندری کہ شاہی

نہ ہے آرزوئے جنت، نہ ہے شوقِ کج کلاہی
مجھے راس آگئی ہے ترے عشق میں تباہی

سرِ حشر میں کہوں گا ترے روبرو الٰہی
ترے لطف سے ہے برتر مرا جرمِ روسیاہی

میں ہوں اپنا خضرِ منزل مجھے شیخ! تجھ سے مطلب؟
تو ہے رہ نشیں نہ رہزن، تو ہے رہنما نہ راہی

ترا وعظ تو ہے واعظ! وہی لفظوں کا پلندہ
نہ دلیلِ حق شناسی، نہ دلیلِ خود نگاہی

کیوں نہ اسی پہ دل جھکاؤں؟ کیوں نہ اس پہ جاں چھڑکوں؟
مجھے کعبے سے سوا ہے مرا اپنا نقشِ پا ہی

جسے دیکھو رزم گہ میں وہی اسلحہ کا طالب
تھی نظر ہی تیغ جن کی وہ کہاں گئے سپاہی

یہ محال ہے کہ واعظ اُسے حرزِ جاں بنا لوں!
نہیں جس بیاں میں شامل دل و چشم کی گواہی

تُلے جب کبھی تو نکلے نہ ہمیشہ ہی برابر
مرا کاسۂ گدائی، ترا تاجِ پادشاہی

نہ سیاست اک جنوں ہے نہ جس میں شرکتِ دنیا
ہو اگر یہ اس میں شامل تو وطن کی سربراہی

مرا دینِ عشق مے کش، ہے تقاضے سے بری تر
نہ ہیں اس میں کچھ اوامر نہ ہیں اس میں کچھ نواہی

یوسف جمال

آزاد غزل کے ساتھ مخالفین کا رویّہ

تاریخ شاہد ہے، جب بھی ادب میں یکسانیت کا بوجھل پن نمودار ہوا، اور ذہن ادب سا گیا تو نئے تجربے کی طرف راغب ہونا ایک فطری عمل بن جاتا ہے۔ تغیر و تبدل ایک فطری امر ہے اس سے چشم پوشی خلافِ فطرت ہے۔

یہ ضرور ہے کہ ادب میں کوئی بھی نیا تجربہ شروع میں غیر فطری طور پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور اگر وہ تجربہ اپنے اندر لچک نیز توانائی کی نشاندہی کرتا ہے تو ابتدا کا غیر شعوری عمل ایک فطری عمل کا روپ بن کر تجربہ کی پرورش و پرداخت کر کے اسے ایک صنف کا درجہ عطا کر دیتا ہے۔

آزاد غزل کو بھی اسی پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تمام تر مخالفت کے باوجود بھی آزاد غزل اپنی حیثیت منوانے میں کامیاب نظر آ رہی ہے۔

غزل اردو ادب کی ایک ایسی جاندار صنف ہے جسے شعری ادب کی شہ رگ سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کیوں کہ غزل سے ہی اردو شاعری کی بھرپور شناخت ہوتی ہے۔ غزل کہی جاتی رہی ہے، کہی جاتی ہے اور کہی جاتی رہے گی۔ اس کی مقبولیت میں کوئی بھی فرق آنے سے رہا جبکہ غزل اپنے مخصوص رنگ سے غزل ہی رہے گی تو آزاد غزل کے فروغ سے غزل کا چہرہ کس طرح مسخ ہو سکتا ہے؟ غزل جو صدیوں کی پونجی

رہی ہے، کیا صنف آزاد غزل سے اس کے ایوان میں کسی زلزلے کی آمد کا خدشہ ہے؟

یہ ایک ایسا مہمل سوال ہے جو ہمارے آج کے کچھ کم سواد نقادوں اور چند تنگ نظر شاعروں اور ادیبوں کے ذہنوں میں بھوت بن کر انہیں ڈرا رہا ہے۔

چنانچہ آزاد غزل کی بنا پڑتے ہی اس پر چو مکھی حملے ہونا شروع ہو گئے۔ اس کے لکھنے والوں پر ایسی ایسی پھبتیاں کسی گئیں کہ توبہ بھلی بھلی۔ یہاں تک کہ انہیں کہہ دیا گیا کہ "تیسرے درجے کے کچھ کمزور شاعروں نے ان دیمک زدہ بیساکھیوں کا سہارا لے رکھا ہے۔ خدا کا شکر ہے میں اپاہج نہیں ہوں اور اپنے مضبوط پیروں سے چلنے میں یقین رکھتا ہوں۔"

محولا بالا پُر مغز اقتباس اردو کے فرسٹ کلاس شاعر عبداللہ کمال کا ہے جنہوں نے آزاد غزل کو دیمک زدہ بیساکھی اور اس کے لکھنے والوں کو تیسرے درجے کے القاب سے نوازنے کے ساتھ انہیں اپاہج تک کہہ دیا۔

اب کسی کے ذہن پر آزاد غزل نشتر بن کر چبھ رہی ہے تو اسے کیا کیا جائے۔ دیمک زدہ بیساکھی اپنے اندر اس قدر کس بل نہیں رکھتی ہے کہ وہ دور تک سہارا بن سکے۔ آزاد غزل کو دیمک زدہ بیساکھی کہہ کر محض دل کی بھڑاس نکالی گئی ہے۔ اب رہا سوال اس کے لکھنے والے کم تر درجے کے شاعر ہیں تو ان تیسرے درجے کے شاعروں میں فیض احمد فیض، حرمت الاکرام، قتیل شفائی، کرامت علی کرامت، نازش پرتاپ گڑھی، کرشن موہن، ماجد الباقری، حیدر قریشی، زرینہ ثانی، سلیم شہزاد، بدیع الزماں خاور، کرشن کمار طور، علی منیر، شہیر رسول، آزاد گلاٹی، ظفر اقبال، ظفر غوری، پرویز رحمانی، علیم صبا نویدی، شعیب شمس اور یوسف جمال وغیرہ جیسے اور بھی سینکڑوں ہیں۔ اب قارئین خود ہی فیصلہ دیں کہ ان میں تیسرے درجے کے کمزور شاعر کون ہیں؟ مظہر امام جو آزاد غزل کے امام ہیں، کہیں وہ تو نہیں؟

شاید عبداللہ کمال نے اپنے ادبی سرمائے کا محاسبہ نہیں کیا ہے ورنہ انہیں خود اپنی حیثیت کا اندازہ ہو جاتا۔ نثری نظم سے متعلق، مدیر شاعر کے نام ایک خط میں وہ گویا ہیں:۔

"تم تو جانتے ہو میں نثری نظموں کو اردو شاعری کے ساتھ ایک فراڈ سمجھتا ہوں۔ دراصل یہ اردو شاعری کے مزاج سے لگا ہی نہیں کھاتا، مگر فراڈ چونکہ میرے عہد کا مقدر بن چکا ہے اس لئے کبھی کبھی ذائقہ بدلنے کے لئے، کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں"۔

یہ خط شاعر کے "نثری نظم اور آزاد غزل نمبر" میں شائع ہوا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اسی شمارے میں عبداللہ کمال کی دو نثری نظمیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ نثری نظم کو اردو شاعری کے ساتھ فراڈ بتا کر' اپنے عہد کو بھی فراڈ تصور کرنا' اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ خود شاعر کے وجود کو بھی ایک فراڈ کہا جا سکتا ہے۔ اس سے عبداللہ کمال کی ذہنی خلا بازیوں کا بھی اندازہ لگ جاتا ہے کہ وہ کس قدر بلند پایہ کے شاعر ہیں۔ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں، اور اس کا ماحصل کیا ہوگا انہیں خود بھی علم نہیں۔ ابھی تو وہ خود ہی تضادات کے محور میں گھوم رہے ہیں تو ان کے ذہن پر اعتماد کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ان کے فرمان کو محض "طفل تسلی" کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

غزل کی طرح آزاد غزل میں بھی فکر کی جلوہ گری اور تنوع کی بھرپور شناخت موجود ہے۔ اس میں اجتہاد اور ندرت کا بڑا دخل ہے۔ پابند غزل میں قیود کی کارفرمائی سے اشعار کہتے وقت بعض لمحے فکر اور جذبے دونوں کا خون ہوتا نظر آتا ہے' اور شاعر وہ بات کہہ نہیں پاتا جو طمانیت کی باعث بنے۔ لیکن آزاد غزل میں ارکان کی کم و بیشی سے شاعر آزادی کے ساتھ بھرپور قسم کے اشعار کہہ سکتا ہے' جبکہ یہ خوبی غزل میں مفقود ہے۔ ایسی صورت میں ڈاکٹر سید حامد حسین کا یہ کہنا کہ:۔

"آزاد غزل جس طرح کے چھوٹے بڑے مصرعے تشکیل دینے کی آزادی دیتی ہے اس میں اجتہاد و تنوع اور ندرت کی گنجائش بجائے خود بہت کم ہیں۔ جو خیال پیش کیا جاتا ہے اسے پابند غزل کی طرح دو مصرعوں میں مکمل ہونا ہے اور ارکان کی تعداد کو لچکدار بنا دینے کے باوجود مصرعوں کی غیر معمولی طوالت یا ان کا غیر معمولی اختصار ہیئتی سقم کا سبب بن سکتا ہے"۔

اگر آزاد غزل میں اجتہاد، تنوع اور ندرت کی گنجائش نہیں ہوتی تو یہ بہت پہلے دم توڑ چکی ہوتی۔ کیوں کہ اب آزاد غزل کو تجربہ کہنا فریبِ شعور کے مترادف ہے۔ اب تو یہ ادب میں باقاعدہ ایک زندہ صنف کی صورت سے اپنی زندگی کا پتہ دے رہی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آزاد غزل آزاد ہے لیکن مصرعوں میں غیر معمولی طوالت اور بے جا اختصار آزاد غزل کے اصول کے منافی ہے۔ مصرعوں کو چھوٹا بڑا کرنے میں تجاوز کرنا ہیئتی اسقام کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسا کہ مقبول احمد نے "شاعر" کے "نثری نظم اور آزاد غزل نمبر" میں ہر مصرع کو غیر معمولی طوالت دے کر آزاد غزل کہنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ خدا جانے اسے آزاد غزل کیونکر تصور کر لیا گیا۔

"بالفاظِ دیگر آزاد غزل محض برائے نام آزاد ہے۔ کیونکہ پابند غزل ایک مستحکم روایت رکھتی ہے، اس کے التزامات ہماری ثقافتی عادتوں کا حصہ بن چکے ہیں۔ اس کا آہنگ ہمارے جمالیاتی نظام میں سرایت کر چکا ہے اور مقدار کے اعتبار سے اس کی تخلیق زیادہ ہو رہی ہے اس لئے یہ اندیشہ غلط نہیں کہ آزاد غزل کا تجربہ اپنی ابتدائی ندرت کا اثر کھو کر بہت جلد پابند غزل میں میں ضم ہو جائے گا۔"

نہ جانے کیوں ڈاکٹر سید حامد حسین نے کن معنی میں لفظ "برائے نام آزاد" کا استعمال کیا ہے۔ یہ تو ڈاکٹر موصوف ہی بتا سکتے ہیں۔ آزاد بہر حال آزاد ہے۔ اس پر

بندش کا فتویٰ صادر کرنا آزاد غزل کی حقیقت سے منہ موڑنا ہے۔ جو ایک غیر فطری فعل کے مرتکب ہونے کے برابر ہے۔

میں نے یہ بات مضمون کی ابتدا ہی میں کہہ دی ہے کہ پابند غزل ادب کی ایک مسلمہ صنف ہے۔ اس سے کسی بھی حال میں آنکھیں نہیں چُرائی جاسکتیں۔ یقیناً اس کے التزامات ہماری ثقافتی اور معاشرتی عادتوں کے اہم جزو ہیں اور ان کی غنائیت ہمارے شعور میں رس بس چکی ہے لیکن غالبؔ جیسے عظیم المرتبت شاعر جو غزل کے دلدادہ تھے اور جن کی پوری شاعری غزل سے بھری پڑی ہے۔ خود انہوں نے بھی غزل کی تنگیٔ دامانی کا پُرزور لہجہ میں شکوہ کیا ہے۔ وہ غزل کے علاوہ ایک ایسی صنف دیکھنا چاہتے تھے جس سے گھٹن کا ازالہ ہوسکے۔ اس لئے انہوں نے بڑی بے باکی اور صاف گوئی سے جب یہ کہا ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

اب ڈاکٹر موصوف سے کون کہے کہ غزل جو ہمارے ادراک کا ایک حصہ بن چکی ہے محض قیود و کہنہ بندشوں سے اظہار میں رکاوٹ محسوس کر کے غالبؔ نے غزل کے دامن کو تنگ قرار دیا ہے، پھر وسعتِ بیان کے لئے ایک نئی صنف کے متلاشی رہے۔ آخر کیوں؟

بلاشبہ آزاد غزل کہنے والوں کے پاس آزاد غزل کی نسبت غزلوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن یہ سوچ بھی برمحل نہ ہوگی کہ آیا آزاد غزل کی ابھی عمر ہی کتنی ہے۔ ظاہر ہے آزاد غزلوں کی تعداد بھی اتنی نہیں ہے جتنی پابند غزلوں کی ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے آزاد غزل کو اب تجربہ نہیں کہا جاسکتا۔ ادب میں اب یہ ایک باقاعدہ صنف شمار کی جارہی ہے۔ آزاد غزل میں اجتہاد و ندرت کا

فقدان ہوتا تو ابتداء ہی میں مر چکی ہوتی۔ اب یہ خدشہ غلط اور بے بنیاد ہے کہ یہ بہت جلد اپنی ندرت کھو کر غزل میں مدغم ہو جائے گی۔ اس میں ایک ایسی تازگی آگئی ہے کہ مستقبل قریب میں آزاد غزل کے فروغ کے امکانات کشادہ تر ہو چلے ہیں۔

اگر ڈاکٹر سید حامد حسین نے (اپنی نظر میں) آزاد غزل کے تحفظ کے امکانات میں شک کیا ہے تو کیا کریں جبکہ اس کے تحفظ کا بیڑا صالح قلم کاروں کے ایک جتھے نے لیا ہے — آزاد غزل کے مسلمہ وجود سے جنہیں اذیت پہنچ رہی ہے تو یہ ان کی کوتاہ بینی ہے اور یہ ان کی اپنی ہی بلائی ہوئی مصیبت ہے۔ آزاد غزل لکھنے والے ان کی گالیاں سن کر بھی ان کی ذہنی کوفت کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔

اس سے انحراف ممکن نہیں، جس طرح پابند غزلوں کے انبار میں بہت ساری غزلیں غیر معیاری ہیں یا بھر جابجا فنی خامیاں اپنی جھلکیاں دکھاتی ہیں یقیناً آزاد غزلوں میں بھی کچھ آزاد غزلیں، آزاد غزل کی روش کے خلاف ہیں۔ لہٰذا غزل و آزاد غزل میں خوبی اور عیب دونوں قدرے مشترک ہیں۔ جس طرح صنف غزل میں ڈھیر سارے شاعروں نے بے تکی یکہ اس کر کے اس کے تئیں مضحک جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح آزاد غزلوں میں بھی چند ایک سہل پسند شاعروں نے استہزائیہ انداز کی آزاد غزل کہہ کر اس کی ساکھ مجروح کرنے کی بھی سعی کی ہے۔ گنتی کے کچھ ایسے بھی شاعر ہیں جنہوں نے آزاد غزل کی تاریخ میں اپنے نام رقم کرانے کے جنون میں چھوٹے بڑے مصرعوں کی مدد سے آزاد غزل کہدی ہے جو آزاد غزل کے زمرے میں نہیں آتی۔

سید مبارک علی کا شمار ادب کے قد آور قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے "آزاد غزل۔ تجربہ کا ایک اور قدم" کے عنوان سے جو مضمون سپرد قلم کیا ہے آزاد نظم اور آزاد غزل سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:۔

"نظم کے لئے ضروری ہے کہ ہر بیت کے مصرعے مساوی الوزن ہوں۔ یہ

حامیوں کا۔

آزاد نظم اس کی زندہ مثال ہے۔ یہی کچھ آزاد غزل کے ساتھ بھی ہو رہا ہے جس سے آزاد غزل مقبولیت سے ہمکنار ہو رہی ہے۔

ادب کا ہر فرد غزل کی انفرادیت کا قائل رہا ہے لیکن ذکاء الدین شایاں نے اپنے مضمون "آزاد غزل - جدت کا ایک تجربہ" میں غزل سے اپنے والہانہ لگاؤ کا اس طرح اظہار کیا ہے جس میں شدت پسندی بری طرح غالب دکھائی دیتی ہے۔ اسی لئے آزاد غزل جیسی صنف ان کے لئے دردِ سر ہو رہا ہے۔ اسے تنگ نظری نہیں تو اور کیا کہا جائے کہ آزاد غزل کے معرضِ وجود میں آنے سے ان کے سینے میں جیسے کوئی سنپولا رینگ رہا ہے۔ غزل ہماری شاعری کی آبرو سمجھی جاتی ہے۔ یہ اپنے اندر ایک نرالی شان رکھتی ہے۔ اس کی انفرادیت یہی ہے کہ یہ اجتماعی طور پر لوگوں کے شعور میں اپنا سکہ بٹھا چکی ہے۔ اس کی مقبولیت میں کوئی فرق آئے ۔ ناممکن! غزل بہرحال غزل ہے لیکن اس کی تنگئ داماں سے شکایت رہی ہے اور رہے گی۔ غالبؔ نے اس میں وسعت کی کمی پر شکوہ طرازی سے کام لیا ہے تو حالیؔ جیسے باوقار شاعر نے غزل کے قیود و بند میں نکر کے گلے کو روندھا دیکھ کر بے اختیار کہا ہے

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

اور نظم کی جانب ایسے راغب ہوئے کہ آخر تک اسی کے ہو رہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ غزل کی ضد آزاد غزل ہے۔ یہ ایک لغو خیال ہے۔ آزاد غزل حالات کے بدلتے ہوئے رجحانات کی پیش خیمہ ہے۔ اگر کوئی نئی صنف ادب میں وارد ہو رہی ہے تو یہ ادب کے لئے فخر کی بات ہے۔ ادب کے خزانے میں مزید اضافے کا امکان ہے۔ مگر یہ امکان ذکاء الدین شایاں کو ناگوار خاطر ہے۔ وہ کہتے ہیں :

"غزل کہنے والوں نے یہ ثابت کر دیا کہ مطلع، ردیف و قوافی اور وزن و مصرعوں

کی تمام پابندیوں کے باوجود اس صنفِ سخن کو ہر عہد کے خارجی اور انفرادی تقاضوں کا امین بنایا جاسکتا ہے تو اب فی زمانہ "آزاد غزل" کے تجربات کا جواز تلاش کرنا اور غزل کے مصرعوں کے ارکان گھٹا بڑھا کر خواہ مخواہ جدت کے نام پر غزل کی ہئیت کو تبدیل کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔"

تجربہ فطرت کی زمین ہے اور ہر تجربہ کے لئے کوئی نہ کوئی جواز پیش نظر ہوا کرتا ہے۔ آزاد غزل کا تجربہ بھی غزل کے دامن کو سمٹتا دیکھ کر کیا گیا۔ اگر غزل کے ساتھ آزاد غزل بھی پروان چڑھے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ کیا آزاد غزل کے پھولنے پھلنے سے ایوانِ غزل میں شگاف پڑنے کا اندیشہ ہے؟ تو جواب میں اسے قطعی بے ہودہ خیال کہا جاسکتا ہے۔

آج آزاد غزل کے ساتھ جو ناروا سلوک برتا جارہا ہے یہی سوتیلاپن اور رویہ آزاد نظم کے ساتھ بھی رہا ہے۔ جارحانہ رویوں سے آزاد نظم روز بروز ترقی کے مدارج طے کرتی رہی اور آج آزاد نظم ادب کا بیش بہا خزینہ بن کر رہ گئی ہے۔ آزاد غزل کے ساتھ جس طرح کی بیجا مخاصمت کی جارہی ہے اس سے آزاد غزل کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوگا۔

ذکاء الدین شایاں آزاد غزل کی مخالفت میں کچھ اس حد تک تجاوز کر گئے کہ فراق کے ایک مطلع اور ایک شعر کو آزاد غزل کی شکل دکھانے سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ انہیں ثابت کیا کرنا تھا؟

شایاں صاحب نے سوچا بے ربط لفظوں کے جوڑ سے آزاد غزل کا شعر ہوسکتا ہے۔ جس طرح انہوں نے فراق کے مطلع و شعر کو آزاد غزل میں ڈھالا ہے اس قبیل کا شعر کوئی مبتدی قسم کا شاعر ہی کہہ سکتا ہے۔ فراق کا مطلع و شعر اور پھر ذکاء الدین شایاں نے انہیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر جس طرح آزاد غزل کے رنگ میں اُستادانہ

انداز سے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) کچھ اشارے تھے جنہیں دنیا سمجھ بیٹھے تھے ہم
اس نگاہ آشنا کو کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

(۲) رفتہ رفتہ عشق مانوس جہاں ہوتا گیا
خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم (فراق)

(۱) کچھ اشارے تھے <u>نگاہ آشنا</u>! ترے <u>تقاضے تھے</u> جنہیں دنیا سمجھ بیٹھے تھے ہم
زندگی کو کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

(۲) عشق مانوس جہاں ہوتا گیا '<u>راز داں ہوتا گیا</u>
<u>ورنہ وہ عالم بھی تھا کہ</u> خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

دیکھا آپ نے! شایاں صاحب نے آزاد غزل کو سہل انگاری سمجھ کر شاعرانہ تصرف سے کام لیتے ہوئے شعری سقم اور حشو سے بھی گریز نہیں کیا۔ مضمون نگار نے آزاد غزل کے شعر کہہ کر اپنی قلعی کھلوادی۔ ہمیں اعتراف کر لینا چاہیئے کہ آزاد غزل وہ ڈفلی نہیں ہے کہ ہر کوئی اسے قرینے سے بجالے۔ ڈفلی کے بجانے میں بھی مشاقانہ انداز سے انگلیوں کو حرکتیں دی جاتی ہیں۔ آزاد غزل لکھنا اس قدر آسان نہیں ہے جتنا مخالفین تصور کرتے ہیں۔

ذکاءالدین شایاں آزاد غزل پر یوں موشگافی کرتے نظر آتے ہیں:۔

"آزاد غزل تجربے کے طور پر اختیار کی جائے یا نئے شعری فیشن کے پیش نظر اس کو جائز قرار دیا جائے اس کی خامیاں واضح ہیں۔ رہیں آزاد غزل کی خوبیاں تو بہت تلاش کرنے اور سر مارنے پر کہیں نہ کہیں مل ہی جائیں گی۔"

آزاد غزل شعری فیشن کے تحت نہیں اختیار کی گئی بضرورت شعری کے طور

پر برتی گئی اور اب تو تجربہ سے نکل کر شعری صنف میں داخل ادب ہو چکی ہے۔ اگر اس کو جائز قرار نہیں دیا جاتا تو یہ پہلے ہی اپنا وجود ختم کر چکی ہوتی۔ ادیبوں کی اکثریت نے اس کو نئی صنف کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ رہیں آزاد غزل میں خامیاں، تو یہ بہرحال موجود ہیں کیونکہ آزاد غزل ابھی نومولود صنف ہے، ابھی اسے کئی ادوار سے گزرنا ہے، تجربات کے کندن میں تپ کر نکھرنا ہے۔ غزل کی گیسو بھی کوئی آنِ واحد میں نہیں سنوری ہے۔ صدیوں کے نشیب و فراز کے جھکولوں کو سہنے کے بعد ہی غزل کی واضح شکل اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ اس کے باوجود بھی غزل میں کہیں نہ کہیں خامیاں جھلکتی رہتی ہیں۔ ایسی صورت میں اگر آزاد غزل میں خامیاں نظر آئیں اور ان پر غلط انداز سے انگلیاں اُٹھائی جائیں تو اس نوزائیدہ صنف پر سراسر زیادتی خیال کیا جائے گا۔ ذکاء الدین شایاں کو آزاد غزل میں سر مارنے کے بعد بمشکل ایک آدھ خوبی مل جانے کی توقع ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شایاں صاحب کچھ اس انداز سے اس صنف سخن سے بدظن ہیں کہ وہ اسے (آزاد غزل کو) یکسر رد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں آزاد غزل میں خامیاں ہی خامیاں نظر آتی ہیں۔ ان کی شعری صلاحیت کا تجزیہ اس لئے بے معنی ہے کہ انہوں نے فراقؔ کے پابند اشعار کو آزاد غزل کے شعروں میں انڈیل کر اپنی سخن پروری کا جو ثبوت دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے آزاد غزل اُن کے بس کی بات نہیں ہے۔

شاہد میر آزاد غزل میں نغمگی دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ انہیں دُکھ ہے آزاد غزل گائی نہیں جا سکتی، نہ ہی موسیقی کے قالب میں ڈھلنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ غزل موسیقی میں گائی جاتی ہے۔ اس لئے لائقِ اعتنا تصور کی جاتی ہے۔ کیا غزل سے موسیقی کا رشتہ نہیں رہتا تو یہ غزل نہیں کہلاتی۔؟ آزاد نظم بھی تو گائی نہیں جا سکتی۔ پھر یہ کس طرح ادب کی ایک تازہ کار صنف بن گئی۔ رہی آزاد غزل کی بات تو چلئے یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ گائی نہیں جا سکتی، کیا اسی لئے اسے ادبِ عالیہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ؟ اگر یہ

نہیں کہ ایک مصرعہ دو رکن کا دوسرا تین یا چار یا پانچ یا چھ بلکہ اس سے بھی زیادہ ۔ لہٰذا آزاد نظم فنی اعتبار سے نظم کہلانے کی مستحق نہیں ہے ۔ یہی بات آزاد غزل پر بھی صادق آتی ہے کسی نے آزاد نظم کی تعریف بہت خوب کی ہے ۔ 'طرزِ نو کی شاعری میں دو جزو دو بحرہ شعر ایک مصرعہ فیل بے زنجیر کی زندہ مثال دوسرا شتر کی دم' ۔ سیماب اکبرآبادی کی رائے سے راقم الحروف صدفی صد متفق ہے "آزاد نظم ۔ نظم اور نثر کے بیچ کی دوغلی صنف ہے جس کا اصلاحی نام نثر موزوں زیادہ مناسب ہے" ۔

سید مبارک علی نے آزاد نظم اور آزاد غزل کو ماننے سے پہلو تہی کی ہے نیز آزاد نظم کو دوغلی صنف کہہ کر سیماب اکبرآبادی کی رائے کی توثیق کر دی ۔

سیماب اکبرآبادی پرانی وضع قطع کے ایک مشاق اور صاحب طرز شاعر تھے اور روایت کی آبیاری میں اپنا خون بہایا ہے ۔ اس لئے آزاد نظم ان کے مزاج کے خلاف رہی ۔ آزاد نظم پر ان کا اعتراض غلط یا صحیح تھا اس پر بحث بے جا ہوگی ۔ لیکن سید مبارک علی ہمارے عہد کی ایک اہم شخصیت ہیں ۔ انہیں سطحی جذبات سے مغلوب ایسی ہر اس رائے سے گریز کی ضرورت ہے جس سے ان کی شخصیت پر حرف آئے ۔

اعلیٰ پائے کے قلم کار میں مستقل مزاجی فن کار کی خوبی گردانی جاتی ہے اور یہی خوبیاں اسے بلند مرتبے پر فائز کرتی ہے ۔ لیکن جب کوئی عظیم قلمکار مستقل مزاجی سے عاری غیر مستقل مزاجی کا ثبوت دیتے ہوئے تضادات کا شکار ہو جائے تو قاری کے ذہن پر غلط اثرات کا مرتب ہونا فطری بات ہے ۔ سید مبارک علی آزاد نظم کی طرح آزاد غزل کو آزاد غزل کہنے میں عار محسوس کرتے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی کہتے نظر آتے ہیں :-

" اس فارم کی مقبولیت یا عدم مقبولیت ہمارے ذوق سلیم کی محتاج ہے ۔ آزاد نظم کی بھی ابتدا میں مخالف رجحانات نے جنم لیا تھا ۔ لیکن آہستہ آہستہ اس

صنف نے اپنے قدم جما ہی لیئے کیوں کہ لوگوں کا مذاق سخن فرصت کے ساتھ بدلنے لگا۔"

دیکھا آپ نے موصوف کی نظر میں جو دونوں اصناف ناقابل اعتنا تھے اب کیسے لوگوں کے دلوں پر منقش ہو گئے۔ رہی آزاد غزل تو مستقبل قریب میں آزاد نظم کی مانند مقبولیت کے دروازے پر کھڑی دیکھ کر فاضل مقالہ نگار ایک آدھ حمایتانہ مضمون لکھ ہی ڈالیں گے۔

سید مبارک علی آزاد غزل کو مستزاد کا دوسرا روپ تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ مستزاد میں ایک مصرعے کے بعد تکرار کے لئے ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی جڑا رہتا ہے جبکہ آزاد غزل میں یہ بات قطعی نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آزاد غزل میں کبھی کبھار ایک آدھ شعر ایسا بھی آجاتا ہے جس میں مستزاد کا گمان ہونے لگتا ہے۔

اس سے کون منحرف ہو سکتا ہے کہ مستزاد ایک مصرع اور ایک ٹکڑے کے باوجود ایک شعر نہیں بن سکتا اور نہ اسے شعر تصور کیا جا سکتا ہے جبکہ آزاد غزل میں معنویت کے ساتھ ارکان کی کمی و بیشی کے تعاون سے ایک مکمل شعر ہوتا ہے۔ تعجب ہے سید مبارک علی جیسے عالم ادب سے ایسی امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ محض اپنی "ہٹ" کو منوانے کے لئے آزاد غزل کو مستزاد کا ہم پلڑا قرار دیتے ہیں اور مستزاد کی متعدد تمثیلوں کو پیش کر کے قاری کو گمراہ کرنے کی ممکنہ کاوشوں سے بھی گریز نہیں کرتے۔ لیکن آج کا باذوق قاری آزاد غزل اور مستزاد کے فرق سے بخوبی آشنا ہے جبکہ آزاد غزل کو مستزاد سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے۔

سید مبارک علی روایت کے پاسدار ہیں اس لئے پابند روایتی فارم کے رسیا دکھائی پڑتے ہیں۔ غالباً یہی روایتی فارم ان کی نظر میں "خالصتاً ادب ہے" ورنہ ان کی نگاہ میں تو آزاد نظم اور آزاد غزل جدید دوغلا فارم ہے جو نہ پوری نظم ہے اور نہ پورا شعر۔ خدا کا شکر ہے کہ موصوف نے آزاد نظم و آزاد غزل کو جدید "دوغلہ" کہنے ہی

پر اکتفا کیا ورنہ وہ مزید ترنگ میں آتے تو مجوزہ عہد (جس میں وہ خود بھی سانس لے رہے ہیں) کو بھی "دوغلہ" کہنے میں تامل نہیں کرتے ۔

سید مبارک علی نے علیم صبا نویدی کی جس آزاد غزل کے مطلع کو شعر کہہ کر نمونے کے طور پر پیش کر دیا ہے، اس سے بحث نہیں، لیکن ان کی خدمت میں عرض ہے کہ علیم صبا نویدی کا یہ مطلع ؎

ہم لے کے کہاں جائیں مصلوب تمنا کو

مجروح تماشا کو

قطعی طور پر مطلع کہلانے کا مستحق نہیں ہے ۔ آزاد غزل کا ہر وہ شعر جو اپنے اندر معنویت کے ساتھ مفہوم ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہی آزاد غزل کا شعر ہو سکتا ہے ۔ یہ مطلع مستزاد کی طرح ہے جو آزاد غزل کے فارم کے خلاف ہے ۔

دراصل علیم صبا نویدی نے نہ جانے کیوں اور کس جذبے کے تحت ایک ساتھ کئی آزاد غزلیں لکھنے کی ٹھان لی اور شاید اسی لئے انھوں نے راتوں رات وہ تمام آزاد غزلیں کہہ لی ہوں گی جو ان کے مجموعے "ردِ کفر" میں شامل ہیں اور یہ تمام آزاد غزلیں فکری دولت سے عاری "آزاد غزل کے فارم کی یکسر نفی کرتی ہیں ۔ اب اگر کوئی صاحب بصیرت ردِ کفر کے حوالے سے آزاد غزلوں کا تجزیہ کرے تو یقیناً آزاد غزل کے ساتھ ناانصافی ہوگی"۔

منطقی شاعری سے ماورا اس میں پابند غزلوں کی طرح تشبیہ و استعارہ نیز ماورائیت و تصادم کے منظر نامہ کے علاوہ علامت سازی و علامت نگاری اور معنوی تجسیم کاری کے نادر نمونے بھی نظر آتے ہیں ۔

مناسب ایجاز و اختصار آزاد غزل کے خاصہ ہیں لیکن مصرع کو اس قدر طول نہ دیا جائے اور نہ اتنا چھوٹا ہو کہ لمبے شعر کہنے میں تامل ہو۔ آزاد غزل میں

ایجاز و اختصار کی حد بندیاں ناگزیر ہیں۔ ان سے ہٹ کر آزاد غزل کہنا گویا آزاد غزل سے فرار حاصل کرنے کے مترادف ہے۔ آزاد غزل نے اس قسم کی بے راہ روی کی اجازت نہیں دی ہے۔

چنانچہ "رد کفر" کی مذکورہ آزاد غزلوں سے ہٹ کر ایسی آزاد غزلوں کی تخلیق وافر مقدار میں ہوئی ہے جس میں جابجا لسانی تجسیم کا عمل کار فرما ہے اور اس عمل میں لفظ و معنی میں پیکریت بلاشبہ منضبط تخلیقی ترتیب سے خوش غنائی کا جادو جگاتی دکھائی دیتی ہے۔

سید مبارک علی کی طرح افتخار امام بھی آزاد غزل کو مستزاد تصور کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں ایک مبلغ کا روپ دھارن کر کے تبلیغی مولویوں کے انداز میں کہتے ہیں :۔

"آزاد غزل کے تجربے کو کوئی نیا ہیئتی تجربہ نہیں کہوں گا"۔

دوسری جگہ گویا ہیں :۔

"آزاد غزل کا تصور ہمارے یہاں مستزاد کی شکل میں موجود ہے۔ لہٰذا آزاد غزل کے سارے تنقیدی محرکات مستزاد ہی سے وابستہ کیے جائینگے"۔

اب اگر کوئی آزاد غزل کو نیا ہیئتی تجربہ ماننے سے انکار کرے یا اسے مستزاد کی شکل تصور کرے تو اس کے لئے کوئی کیا کر سکتا ہے۔ افتخار امام کے ان فرمانوں سے (تصور شکی زیر کے لئے سمجھ لیجئے) آزاد غزل کا سارا قضیہ ختم ہو گیا۔

آج یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ تو ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے۔ جب بھی ادب میں کسی تغیر و تبدل کا چرچا ہوا ہے۔ مخالفین کی جانب سے طوفانی حملے ہوئے ہیں لیکن دیکھا جائے تو ان ہی مخالفین نے ہر تجربہ کو جلا بخشی ہے۔ اسے بقائے دوام کی سند دلانے میں ان کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے جس قدر کہ تجربہ کو پروان چڑھانے والے

نظر آرہا ہے جبکہ زندگی کے بدلتے ہوئے عمرانی تقاضوں کے پیش نظر ہیئت ادب میں تغیر و تبدل ناگزیر ہے۔ آزاد غزل اسی کا پیش خیمہ ہے ۔۔۔ آزاد غزل میں ہیئتی اور موضوعاتی تبدیلیوں سے اگر کوئی منکر ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ اگر کوئی حقیقت کو حقیقت ماننے سے انکاری ہو یا پھر کسی کو فقط اپنی دھن پیاری ہو اور دوسروں کے راگ اپنی ڈفلی کے آگے پھیکے لگیں تو اس میں کسی کا کیا قصور ۔۔۔ !

آج کے ادب میں مختلف قسم کے تجربوں کی نوعیت کے ساتھ بالخصوص ہیئت میں تبدیلی کا نمایاں رنگ غالب ہے۔ لہٰذا آزاد غزل کی صنف موضوعاتی اور ہیئتی دعوئی کو یکسر غلط قرار دیتی ہے۔ وارث علوی، ڈاکٹر افضل امام، ڈاکٹر یوسف خان، پروفیسر گیان چند، ڈاکٹر شمیم حنفی، کرشن موہن، ابوالکلام قاسمی اور ستیہ نند جاوا کی نظروں میں ادب کو اختیار ہے کہ بدلتے ہوئے احوال کے پیش نظر ہیئتی اور موضوعی تبدیلیاں پیدا کرے۔

مغنی صاحب روایتی غزل کی یکسانیت سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ ہم تو ادب میں موزونیت و تناسب اور توازن کے ساتھ تغیر و تبدل بھی چاہتے ہیں، جن میں اسلوب و آہنگ، الفاظ و تراکیب، علائم و مفاہیم کی وسعتوں اور گہرائیوں کے نئے نشانات نمایاں دیکھ رہے ہیں۔ اس سے صرف مغنی صاحب ہی منکر ہو سکتے ہیں کہ نئے موضوعات، نئی زندگی کی دین ہیں، جو آج کے ادب کا خاصہ ہے۔

(۴) مغنی صاحب کو کلیتاً اختیار ہے کہ وہ دور جدید کی جدتوں اور جدت پسندیوں کا محاسبہ کریں لیکن محاسبہ سے قبل یہ سوچ بھی سامنے رکھنا پڑے گی۔ آپ کو ڈاکٹر یوسف حسین خان، پروفیسر گیان چند، وارث علوی، ڈاکٹر افضل امام، ڈاکٹر شمیم حنفی، کرشن موہن اور ابوالکلام قاسمی کے ساتھ بیشتر قد آور نقادوں اور شاعروں کا بھی محاسبہ و محاکمہ کرنا ہوگا جو ادب میں ہیئتی تجربات میں تنوع کے قائل ہیں۔ مغنی صاحب خود

کو آج بھی صدیوں پرانی فضا میں سانس لیتے ہوئے محسوس کر رہے ہیں۔ انہیں آج کے احوال اور بدلتے ہوئے عمرانی تقاضوں کا احساس بھی ہے کہ نہیں؟ یا پھر یوں ہی پرانی گھسی پٹی باتوں کو نئے اذہان کے سامنے رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں — اب تو آپ "مریخ" دوبارہ نکالنے جا رہے ہیں۔ اسی سے جدلیوں اور جدت پسندیوں کی روک لگائیے لیکن مریخ کا پھر وہی حشر نہ ہو جو کئی سال پہلے ہو چکا ہے کہ چند شماروں کے بعد اسے بند کر دینا پڑا تھا۔

اردو ادب کو مغنی صاحب جیسے لوگوں نے مقید و محصور کر رکھنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ ان کا یہ فعل ایک ایسی بدعت ہے جو خلافِ ادب ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے ادب کی کوئی خدمت ہوتی ہے۔

پابند غزل اور آزاد غزل پر تجزیہ کر کے آزاد غزل میں جو بھی سقم اور حشو زائد پر معترض ہیں تو ہوا کریں لیکن اس سے انحراف کون کر سکتا ہے۔ پابند غزل میں بھی حشو و زائد ہوتے ہیں تو کیا عجب ہے اگر آزاد غزل میں نظر آ جائیں۔ ترسیل میں ناکامی کا مسئلہ ادب میں ناگزیر ہے۔ بہرحال حشو و زائد کے معترضین کے لئے ڈاکٹر کرامت علی کرامت کی درج ذیل رائے ایک تازیانہ ثابت ہوگی:

"آزاد غزل کے قالب میں وہ تمام مضامین سموئے جا سکتے ہیں جو پابند غزل میں سموئے جاتے ہیں لیکن آزاد نظم کی طرح یہ صنف جدید حسیت کے اظہار کے لئے زیادہ موزوں ہے، نیز جدید حسیت کے ساتھ اگر فکر کی چاشنی بھی شامل ہو جائے تو اس صنف میں چار چاند لگ جائیں گے۔ آپ نے یہ بھی اندازہ لگایا ہو گا کہ صنف غزل کی طرح اس قدر حسیت Compact ہو سکتی ہے کہ اس کا کوئی لفظ اپنی جگہ سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ جس آزاد غزل میں یہ صنف مفقود ہو اسے کامیاب آزاد غزل نہیں کہا جا سکتا۔

لہذا کمزور آزاد غزلوں سے مثالیں دے کر یہ ثابت کرنا کہ اس صنف میں حشو و زائد پائے جاتے ہیں، عین ناانصافی ہے"۔

(مضمون آزاد غزل ۔ میری نظر میں)

آج جس طرح آزاد غزل بحث کا نشانہ بنی ہوئی ہے اور اس پر ایسے سطحی فقرے کسے جارہے ہیں کہ توبہ ہی توبہ! بقول شخصے اگر آزاد غزل کا تجربہ غالب کی طرح کسی عظیم شاعر نے کیا ہوتا تو اب تک اسے غیر معمولی شہرت مل چکی ہوتی۔ مظہر امام نے آزاد غزل کا تجربہ کرڈالا تو خانوں میں منقسم لوگوں کے منہ بگڑ گئے۔ انہیں اس بات کا بے حد قلق ہے۔ آیا یہ تجربہ انہی کے حلقے کے کسی فرد نے کیوں نہیں کیا؟ یہی سوچ ہر حلقہ بگوش کو ستا رہی ہے اور مظہر امام نیز اس کے لکھنے والوں کو گالیوں کے تحائف پیش کئے جارہے ہیں۔ یہ بیچارے دن رات اسی غم میں گلے جارہے ہیں کہ آزاد غزل کو کچلنے کے لئے ابھی تک جتنی کوششیں کی ہیں، ہونا تو یہ چاہیئے تھا آزاد غزل کو کب کا فنا کے گھاٹ اُتر جانا تھا۔ مگر اس کے برعکس یہ شب و روز تیزی سے مقبولیت کی راہوں پر گامزن ہے۔

آزاد غزل پر آزاد غزل کے مخالفین منافقانہ رویے اپنائے ہوئے ہیں۔ آزاد غزل اور آزاد غزل کے لکھنے والوں پر لعن طعن کر رہے ہیں لیکن کسی زبان کو روکا نہیں جاسکتا۔ یہ لوگ خود ایک روز خاموش ہوجائیں گے۔

کسی شے کو جب شدت سے چاہا جاتا ہے تو دل و دماغ ماؤف ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی حال پابند غزل کے انتہا پسندوں کا ہے۔ وہ جذبات کی لہروں کے بہاؤ میں جو کچھ کہہ رہے ہیں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو یہی آزاد غزل کے حق میں بہتر ہوگا ۔ ٥

ایم۔عالم

طنز و مزاح کے جھروکے سے...

کہا جاتا ہے کہ دُنیا کا کوئی ادب طنز و ظرافت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا ہے۔ جس طرح زندگی میں طنز و مزاح کی اہمیت ہے اسی طرح ادب میں طنز و ظرافت کا بڑا اہم مقام ہے۔ فنونِ لطیفہ کی طرح طنز و مزاح بھی ایک اعلیٰ و ارفع فن ہے۔ بعض افراد طنز و ظرافت کو محض دلبستگی اور بہلاوے کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ لیکن یہ ننگی سچائی اور عریاں حقیقت ہے کہ طنز و مزاح کوئی گھٹیا شئے نہیں بلکہ اس کے ذریعہ اعلیٰ اَدب پیش کیا جا سکتا ہے۔

کچھ لوگ طنز و مزاح کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیتے ہیں۔ حالاں کہ طنز و مزاح میں نمایاں فرق ہے۔ معمولی ظرافت کو مزاح کہتے ہیں۔ مزاح میں کوئی ہمہ گیریت نہیں ہوتی مگر طنز کو مزاح پر فوقیت حاصل ہے۔ طنز میں ایک ہمہ گیر جذبہ ملتا ہے۔ ادب و فن اور شعر و سخن میں طنز برپا کرنے کے لئے مشاہدے کی گہرائی، تجربات کی پختگی، بھرپور وسیع النظری، خالص جذبات و احساسات کی بڑی ضرورت پڑتی ہے۔

ایک روسی ادیب کا مقولہ ہے کہ "مذاق اڑانا مذاق نہیں ہے"۔ ایک فرنگی مصنف کا قول ہے کہ "مزاحیہ نگاری سے آسان تر شاید ہی کوئی صنف ہوگی"۔ آنجہانی کنہیالال کپور نے کہا ہے کہ "اگر طبیعت موزوں ہو اور احتیاطی نظربندی کا ڈر نہ ہو تو مذاق اڑانا اتنا ہی آسان یا دشوار ہے جتنا شعر کہنا۔ تقریر کرنا یا قوالی پر سر دُھننا"۔

بات ہے تو آزاد نظم کو بھی ادب سے خارج کر دیا جائے۔ کیا شعری ادب محض مشاعروں اور گویّوں کی بدولت زندہ ہے؟ مشاعروں میں پیشہ ور شعراء گھسی پٹی غزلوں سے اپنی دکانوں کو چمکائے ہوئے ہیں اور گلوکار بھی ایسی چیزیں گاتے آئے ہیں جن کا ادب میں کوئی مقام نہیں ہے۔ ادب ہر حال میں ادب ہے۔ یہ اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اس میں گوناگوں خوبیوں سے مزین معیاری چیزیں کثیر تعداد میں ہوں۔ اگر سُر اور تال میں سر دُھننے کا نام ادب ہے تو ایسے ادب سے ہمارا کوئی علاقہ نہیں کیوں کہ سُر اور تال میں سر دُھننے والی چیزیں لمحہ حسن کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ ان سے وقتی طور پر تو دل بہلایا جا سکتا ہے جبکہ روح اور ذہن کو بالیدہ کرنے والی چیزیں ادب کی تقویت کی باعث رہی ہیں۔

شاہد میر خواہ مخواہ رنجیدہ ہیں کہ آزاد غزل گائی نہیں جا سکتی۔ بصورت دیگر اس کے لئے آزاد موسیقی کی ایجاد چاہتے ہیں، جو آزاد غزلوں کو راس آئے۔ وہ کہتے ہیں:

"اگر آزاد غزل کا گانا واقعی ضروری ہے تو ہمیں یا تو مخدوم کی نظم کی طرح کھینچ تان کر مصرعے پڑھنا ہوں گے یا دوسری صورت یہ ہے کہ آزاد غزل کے لئے آزاد موسیقی کا انتظام تیار کیا جائے۔ نئی تالیں بنائی جائیں جو آزاد غزلوں کو راس آ سکیں"

ادب موسیقی کا محتاج نہیں رہا ہے یا یہ کہ موسیقی کے بغیر ادب پھول پھل نہیں سکتا۔ یہ ایک عجیب سوچ ہے۔ شاہد میر کو جاننا چاہیئے کہ ادب موسیقی کے بغیر ہی ترقی کے مدارج طے کرتا ہے۔ آج آپ اردو کی پابند غزل و نظم کو موسیقی کے سہارے سے سُر اور تال میں گا رہے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ادب موسیقی سے ہی زندہ ہے۔ شاہد میر صاحب سے کوئی یہ دریافت کرے آیا ہندی ادب کے پاس اپنا جو ذخیرہ ہے اور آج ہندی ادب کا اس کا جو اپنا مقام ہے وہ محض موسیقی کا مرہون منت ہے؟ ہندی کی کتنی چیزیں موسیقی میں گائی جاتی ہیں؟ پھر ہندی ادب زندہ کیسے ہے؟ اسے تو کب کا ختم ہو جانا

چاہیے تھا۔

اسی طرح آزاد غزل بھی موسیقی سے اپنا ناطہ جوڑے بغیر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتی جارہی ہے۔ آج آزاد غزل پر مخالفوں کی جانب سے اور اس کے حامیوں کی طرف سے جس کثرت سے بحث و مباحث ہو رہے ہیں، ان سے آزاد غزل کی مقبولیت میں شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

عبدالمغنی صاحب کٹر روایت پسند رہے ہیں۔ ترقی پسندی کا لیبل اُن پر چسپاں ہے۔ ان کی نظر کو جب آزاد نظم اور نئی پابند غزل نہیں بھا سکیں تو چہ جائیکہ آزاد غزل .....

"ہماری شاعری میں آزاد نظم کی کوئی روایت نہیں ہے بلکہ نظم معریٰ کی روایات بھی مفقود ہیں"

"نئی اردو غزل کی لفظیات پہلے ہی مزاجِ غزل کے لئے ایک آزمائش بنی ہوئی ہے"۔

مغنی صاحب پرانی یادگاروں میں سے ہیں۔ ظاہر ہے نئی شاعری ان کے من کو بھاتے سے رہی۔ مغنی صاحب گل و بلبل اور وصل و ہجر کی حد بندیوں کے قائل ہیں۔ وہ آج بھی اسی قبیل کے اشعار پڑھ کر خود کو اور دوسروں کو محظوظ کرتے ہیں۔ نئی شاعری میں دل کے دھڑکنے کی کرتب بازیاں مفقود ہیں تو پھر انہیں ایسی شاعری پسند کیوں آنے لگی۔ جن کے ذہن میں گھسی پٹی روایت کی پرتیں جمی ہیں ــــ انہیں نئی چیزیں بے جا جدت اور نیشن نظر آتی ہیں۔ وہ روایت کے اس شدت سے حامی ہیں کہ وہ اپنے پرچے "مریخ" کے لئے اعلان کرتے ہیں۔ "اس میں آزاد نظم اور جدید چیزیں نہیں شائع ہوں گی"۔ آزاد غزل کے ضمن میں ان کے ارشادات ملاحظہ کیجیے:۔

(۱) "آزاد غزل کی ترکیب نثری نظم سے بھی بڑا عجوبہ ہے۔ اور غزل کم آزاد زیادہ ہے۔ آخر آزاد غزل سے کس چیز میں اضافہ ہوتا ہے؟ آزاد غزل میں یا تغزل میں؟ کیا وہی بات پابند غزل میں بہتر طور پر نہیں کہی جا سکتی جو آزاد غزل میں کہی جاتی ہے؟"

(۲) "زیادہ سے زیادہ یہ ایک مذاق ہے اور لطیفہ سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت یا افادیت نہیں۔ غزل کو آزاد کرانے کی کوشش درحقیقت ایک غلامانہ ذہنیت کی غماز ہے"۔

(۳) "حسن کاری کی پہلی شرط موزونیت اور تناسب و توازن ہے جبکہ آزاد غزل کی کوشش تناسب و توازن کے خلاف ناموزونیت کی بغاوت سے زیادہ کچھ نہیں"۔

(۴) "وقت آ گیا ہے کہ دورِ جدید کی جدتوں اور بدعت پسندیوں کا محاسبہ کیا جائے۔ ان کی بیکار آزادروی پر روک لگا دی جائے تاکہ ذہنِ انسانی کی تخلیقی آزادی برقرار رہے اور وہ میکانکی آلات اور ان کے پیدا کئے ہوئے اسباب کا غلام نہ بن جائے"۔

(۱) مغنی صاحب روایتی غزل ہو تھوک کے بھاؤ میں تخلیق ہو رہی ہے پر کچھ زیادہ ہی نازاں دکھائی دیتے ہیں ——— وہ آزاد غزل کو نثری نظم سے بھی عجوبہ شے سمجھنے پر مجبور ہیں۔ وہ لکیر کا فقیر بنے رہنے پر ہی قناعت کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں ادب میں تغیر پذیری ایک آنکھ نہیں بھا رہی ہے تو انہیں اپنی اس عینک کا شیشہ بدلوا لینا چاہیے۔ جو وہ آزاد غزل میں تغزل کے دیکھنے کے مشتاق ہیں۔ کیونکہ زلف گرہ گیر کے عشاق تخیل میں بھی محبوب کو اپنی بانہوں میں بھینچ لینے پر قادر ہیں بھلا وہ کس طرح اپنے حصار کو توڑ کر باہر آنا پسند کریں گے۔ انہیں یہ مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی روایتی انداز کی غزلوں میں ہی مگن رہیں اور انہی کو ادبِ عالیہ گردانتے رہیں جس طرح کنوئیں کے مینڈک کو وہی کل کائنات

نظر آتی ہے اسی طرح یہ لوگ غزلوں کے گڑھے کو ہی کائنات سمجھ کر کے مینڈکوں سے زیادہ آگے نکل سکتے ہیں ــــ ان کی ذہنیت کی آرائش سے آزاد غزل کی ترقی رکنے سے رہی۔

(۲) اگر مغنی صاحب کی نظر میں آزاد غزل ایک مذاق سے بھی زیادہ لطیفہ ہے تو انہیں آزاد غزل کا احسان ماننا چاہیئے کہ جو وہ محبوب کے فراق میں سوکھ کر کانٹا ہو رہے ہیں کم از کم آزاد غزل کے لطیفے سے انہیں ہنسنے کا موقع مل رہا ہے۔ چلیئے مان بھی لیا جائے کہ آزاد غزل کی حیثیت ہے اور نہ ہی اس میں افادیت! "عقل کے اندھوں کو ساون کی ہریالی بھی خشک محسوس ہوتی ہے"۔ ان کے لئے دن رات دونوں برابر ہیں۔ اگر آزاد غزل غلامانہ ذہنیت کی عکاس ہے تو انہیں مکمل اختیار ہے وہ جو سڑی گلی زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں جب چاہیں تخیل کے پر لگا کر خلا میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اپنے آپ کو یہ کہہ کر خوش ہو لیں کہ ہم آزاد ہیں۔ خوش فہمی کا علاج ممکن نہیں یہ ایک ایسا مرض ہے جس سے آدمی ہلاکت کی قبر میں دھنس کر رہ جاتا ہے۔ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھ کر زندہ رہنا خلاف فطرت ہے۔ اس سے جبلی صلاحیتوں پر زنگ لگ جاتا ہے جس طرح ایک گونگا سب کو گونگا سمجھتا ہے اسی طرح غلامانہ ذہنیت رکھنے والا بھی سب کو اپنی طرح غلام سمجھتا ہے۔

(۳) مغنی صاحب ابھی بھی حسن کاری کی بات کرتے ہیں۔ فی زمانہ حسن کاری ہے کہاں۔؟ (شاید موصوف اس کا پتہ جانتے ہیں)۔ آج کل غازوں، لپ اسٹکوں اور آئی برووں سے حسن زندہ ہے۔ موصوف شرطوں کے بھی عادی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ بات بات پر شرط لگانا چاہتے ہیں، جبکہ یہاں شرط کا محل مہمل ہے۔ آزاد غزل میں شرط سے ماورا موزونیت اور تناسب کے ساتھ ساتھ توازن بھی موجود ہے ــــ اب اسے کیا کہیئے کہ مخالفین کو آزاد غزل میں موزونیت و توازن وغیرہ کا فقدان

مذاق اڑانے کے متعلق سب سے بڑا مذاق یہ ہے کہ جب کبھی مزاحیہ نگار کا نشانہ چوک جاتا ہے وہ بیچارہ خود مذاق کا نشانہ بن جاتا ہے۔ شاید اسی لئے یسوع مسیح نے انجیل مقدس میں فرمایا ہے کہ "کسی پر تنقید مت کرو تاکہ کوئی تم پر تنقید نہ کرے"۔ مزاح اور خاص کر طنز بہت حد تک (ایک قسم کی شگفتہ تنقید ہے۔ میری دانست میں اچھی طنز لکھنے کے لئے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔۔ اچھا ماخذ، تیز اور طرار طبیعت، دماغی توازن۔۔ اگر تینوں میں سے ایک چیز کی بھی کمی واقع ہو جائے تو طنز' طنز نہیں رہتی دشنام یا ہجو بن جاتی ہے"۔

مندرجہ بالا باتوں سے بحُسن و خوبی یہ سُراغ ملتا ہے کہ طنزیہ پیرایہ بیان سب کے بس کی بات قطعی نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک خاص طور کی ذہنیت درکار ہے۔ طنز ہجو سے بہت بلند اور وسیع ہے۔ اس لئے بعض تبصرہ نگاروں نے بالکل درست طور پر کہا ہے کہ ایک ہجوگو کے لئے کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ طنزیہ شاعری کرے۔ بلکہ ہاجی طنزگو نہیں ہو سکتا۔ ہجوگوئی کی پرواز تخیل طنزگوئی کی رفعت تک نہیں پہنچ سکتی ہے۔ نثر میں طنزیہ پیرایہ بیان کرنا نظم کی نسبت کسی حد تک آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نثر نگار کے یہاں طنزیہ رنگ کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ مگر نظم میں بہت کم شعرائے کرام طنزیہ شاعری کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہجوگو شاعر ہر زبان میں بے شمار گذرے ہیں۔ مگر طنزیہ کلام پیدا نہ ہو سکا۔

مومن ہجوگوئی کے سخت مخالف تھے۔ اسی لئے تو انہوں نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ ؎

ہجوگوئی نہیں ہمارا کام
ایسی باتوں سے خامشی بہتر

اردو ادب میں طنز و ظرافت کا ہمیشہ سے زبردست فقدان رہا ہے۔ ہجو کی روایت ضرور رہی ہے لیکن اس کا شمار اعلیٰ ادب میں نہیں ہو سکتا ہے۔

دنیا کا ہر ادیب دنیا اور زندگی کے متعلق ایک خاص نظریہ رکھتا ہے اور یہی نظریہ زندگی اور زندگی کے تجربات کے سمجھنے میں معاون و مددگار ہوتا ہے۔

میدانِ حیات میں طنز و مزاح نہایت اہم رول ادا کرتے ہیں اور دنیا جہاں کے ادبیات میں طنز و مزاح نے ایک نمایاں حصّہ لیا ہے۔ انگریزی ادب میں طنز نے کارِ نمایاں انجام دیا ہے۔ یوں تو انگریزی ادب میں طنز و مزاح نگاروں کی کمی نہیں ہے لیکن اسٹیل (Steel) اور سوفٹ (Swift) اپنی طنزیہ تحریر کی بدولت بہت مشہور و معروف ہیں۔

انگلستان میں ایک بار قحط و افلاس کا زور و دورہ تھا۔ بوڑھے، جوان سب کو فاقوں سے اپنی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ حکومت برطانیہ پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے حتی الامکان کوشش و کاوش میں لگی ہوئی تھی لیکن کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی، کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ جوناتھن سوفٹ (Jonathan Swift)، کی زندگی برطانیہ کے خوشحالی کے زمانے میں بھی تنگدستی کے ساتھ بسر ہو رہی تھی۔ اب ملک میں قیامت صغرا ہی برپا تھی۔ اس کا کوئی پرسانِ حال تھا۔ آخرکار حکومت کی تدبیر جب اس صورت حال کو بدلنے میں ناکامیاب رہی تو سوفٹ نے تنگ آکر ایک قیامت خیز تجویز (A madest Proposal) پیش کیا۔ اس کی اس تجویز نے ملک میں تہلکہ مچا دیا۔ اس نے یہ تجویز دی تھی کہ غریب والدین کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ذبح کر دیا جائے۔ اس کی رائے تھی کہ ان کا گوشت کافی لذیذ ہوگا اور خاص طور پر ان کا کباب نہایت عمدہ ہوگا، سینہ قورمے کے لیے بہت موزوں ہے۔ اس تجویز کا فائدہ یہ دکھلایا تھا کہ ان بچوں کو حلال (ذبح) کرنے سے ان کے والدین کو ایک بڑی مصیبت اور فکر سے نجات مل جائے گی۔ یہ لڑکے جو غذا کھاتے وہ بچ جائے گی اور دوسرے ان کا گوشت فاقہ زدہ لوگوں کے لئے خود غذا کا کام دے گا۔ یہ تجویز سرکار برطانیہ پر بڑی گہری طنز تھی کیوں کہ سرکار برطانیہ قحط پر قابو نہ پا سکی تھی۔

طنز میں اتنی شدید گہرائی ہوتی ہے کہ حساس آدمی شدت احساس سے رو دیا کرتا ہے۔ اسی لئے تو یہ بات ہمالیائی حقیقت کی حامل معلوم ہوتی ہے کہ "باریک بیں نگاہوں کو تو خوشی میں غم کی آمیزش اور ہنسی میں رونے کی جھلک دکھائی دیتی ہے"۔

اسی کیفیت کو خواجہ میر درد نے پیش کیا ہے کہ:-

جگ میں کوئی ٹک ہنسا ہوگا
کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

جب آدمی بہت زیادہ ہنستا ہے تو آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ الغرض طنز و مزاح میں چولی دامن کا رشتہ ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح مسرت سے غم دور نہیں ہوتا ہے۔ دنیا میں کون سا فرد ہوگا جو شادی و غم سے دوچار نہیں ہوا ہوگا؟ اسی لئے تو ذوق نے کہا ہے کہ:-

ہنسی کے ساتھ یہاں رونا ہے مثل قلقل مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

انگریزی ادبیات کی طرح اردو ادب میں بھی بہت سارے ادیب طنزیہ اور مزاحیہ مضامین، افسانے، ناول، انشائیے، خاکے وغیرہ وغیرہ لکھے ہیں اور لکھتے جا رہے ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی، مرزا فرحت اللہ بیگ، انجم مانپوری وغیرہ وغیرہ کے یہاں محض ظرافت ہے۔ وہ صرف مسکراہٹ پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ ہنسوڑے قسم کے فن کار ہیں۔ مزاح نگاری میں انہوں نے نئے راستے ضرور نکالے ہیں۔ یہ الفاظ سے مزاح اور ظرافت پیدا کرنے میں جواب نہیں رکھتے۔ ان کے مزاحیہ فن پاروں میں خالی خولی مزاح ہوتا ہے۔ سماجی زندگی پر گہری اور بھرپور طنز نہیں ہوتی ہے، نہ طنز جس میں تیزی ہو اور تیزابی کیفیت ہو اور جو نشتر کا کام کرے۔ نہ مزاح نہ ظرافت کو طنز پر فوقیت دیتے ہیں حالانکہ طنز کو مزاح پر فوقیت ہونی چاہیئے۔ ان کے طنز و مزاح میں کوئی سماجی

مقصد نہیں ملتا ہے۔ وہ چلتی پھرتی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کہانیاں لکھتے ہیں اور مزاح پیدا کرتے ہیں۔

اس کے برعکس سعادت حسن منٹو جو اردو ادب کا بدنام زمانہ فنکار ہے اس کی جنسی گندی کہانیاں انتہائی طور پر مقبول ہو چکی ہیں۔ اس کے فکر و فن میں بلا کی سادگی ہوتی ہے۔ وہ پیار کرتے کرتے یکایک بھرپور طمانچہ رسید کر دیتا ہے۔ ہمارے سماج میں طبقات ہیں۔ اس لئے اس کی نگاہیں سماج کے طبقوں کی ناگفتہ بہ حالتوں پر نہایت کڑی ہیں۔ اس نے اپنے اکثر افسانوں میں نیچے اور اونچے طبقوں کے فرق کو واضح کیا ہے اور سماج کی نفسیات کا نہایت ہی فنکارانہ تجزیہ کیا ہے۔

اور پھر کرشن چندر، شوکت تھانوی، پطرس، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، خوشتر گرامی، فکر تونسوی، ظفر پیامی، کنہیا لال کپور، واجدہ تبسم وغیرہ وغیرہ نے بھی اپنے فن میں ہمارے معاشرے کے ماحول کی بڑی خوبصورت تصویریں پیش کی ہیں۔ ان کے یہاں ماحول کی اچھی عکاسی ہے۔ ساتھ ساتھ طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہے۔ گندے اور تاریک گوشوں پر تنقید ہے۔ اس طرح طنز و مزاح سے ان کے فن میں ایک ستھرا راستہ پیدا ہوتا ہے جس راستے پر نشیب و فراز ہیں۔ اس طرح ہمارے موجودہ فنکار ہمارے معاشرے کی راہ نمائی اپنے فکر و فن کی وساطت سے کر رہے ہیں۔

منٹو کے طنزیہ افسانے ایسے چاکلیٹ ہوتے ہیں جن کی مٹھاس چوستے چوستے یک بیک ختم ہو گئی اور وہ کونین کی ٹکیہ بن چکے ہوتے ہیں۔

پطرس مرحوم کبھی کبھی شوکت تھانوی سے آگے نظر آتے ہیں۔ ان کا لاہور کا جغرافیہ اور بائیسکل پڑھ کر دیکھئے۔ خود شوکت تھانوی مرحوم نے ایک جگہ پطرس مرحوم کی تعریف کی تھی۔ خوشتر گرامی، فکر تونسوی اور ظفر پیامی ایک زمانے تک "بیسویں صدی" میں لکھتے رہے ہیں۔ خوشتر گرامی "تیر و نشتر" کے عنوان سے چھوٹی چھوٹی خبروں پر نہایت ہی گہری طنز کرتے۔ فکر تونسوی

"اور سائیں بابا نے کہا" اور انھاہیں کے عناوین سے "نظر بیانی" "آنکھیں میری باقی اُن کا" کے عنوان سے سماج کی ٹھوس حقیقتوں پر کارتاثیر بھی لگاتے رہے ہیں۔ یہ حضرات طنز کو مزاح پر فوقیت دیتے رہے ہیں۔

کنہیا لال کپور مرحوم ایک اچھے طنز نگار تھے۔ ان کی تخلیق میں ماحول اور زندگی پر بھرپور طنز ملتی ہے۔ ان کے بھی اکثر افسانے "بیسویں صدی" میں طنز و مزاح کا لطیف امتزاج لیکر آتے رہے۔ "الم غلم" ان کا ایک خوبصورت افسانہ ہے جس میں کشمیر، ہندوستان اور پاکستان پر نہایت ہی نرالے ڈھنگ سے طنز کیا گیا تھا ان کے افسانوں اور انشائیوں کے مجموعے شائع ہوکر آچکے ہیں۔

کہتے ہیں کہ اکبر الہ آبادی سے پہلے اُردو شعر و ادب میں خطوط غالب کے علاوہ طنز و ظرافت کی کوئی صحت مند روایت نہیں ملتی ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اُردو شاعری کو وہ کچھ بخشا جو اس میں نہیں تھا اور جس کی اس میں ضرورت تھی۔ انھوں نے اُردو شاعری میں اس صنف کو داخل کیا جس کے بغیر کوئی شاعری عظیم اور مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ ان کے عقائد سے چاہے ہم اتفاق نہ کریں، ان کی طنز و ظرافت کے موضوع سے بجائے خود ہم چاہے اختلاف کریں، لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ انھوں نے اُردو شاعری کی ایک بہت بڑی کمی پوری کر کے اس میں تکمیل کی شان پیدا کر دی۔ ادب میں طنز و ظرافت کا داخل ہونا بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ زبان اور اہل زبان اور کلچر کی ایک خاص بلندی اور پختگی شعور کی ایک خاص منزل پر آگئے ہیں۔ اگر اُردو ادب سے اکبر الہ آبادی کو الگ کر لیا جائے تو سلسلۂ عظمت کی ایک کڑی کم ہو جائے گی۔

اختر اورینوی مرحوم نے اپنی کتاب "کسوٹی" میں لکھا ہے کہ "اُردو شاعری میں اکبر الہ آبادی کا ایک مخصوص درجہ ہے۔ اگر شاعروں کی تقسیم کی جائے تو بعض شاعر اپنے فن کی وجہ سے، بعض اپنی شخصیت کی وجہ سے، بعض ان دونوں کی وجہ سے منفرد ہوتے

ہیں۔ شخصیت کے اعتبار سے منفرد کم ہیں اور اُن رد عمل کے اعتبار سے منفرد ادب بھی کم ہیں۔ اکبر الہ آبادی کی اہمیت ایک طرف تو تاریخی ہے اور دوسری طرف ان کے فن یا موضوع کے اعتبار سے ہے۔ اکبر الہ آبادی کے سرمایۂ فخر کا ایک اہم جزو یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو سیاست اور کلچر سے قریب لانے کی کوشش کی۔ اپنے معاصرین اور متقدمین میں وہ سب سے زیادہ ہندوستانی ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے معاصرین کی کاوشیں بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن اکبر کا تصرف زیادہ براہِ راست ہے۔ خالص ملکی اثرات جتنے اکبر کی شاعری میں نمایاں ملیں گے بہ مشکل دوسروں کے یہاں نظر آئیں گے۔"

مغربی تہذیب کے متاثرین مغلوبین تو یہ کہتے ہیں کہ "اکبر کی ساری زندگی مغرب پرستی کے ماتم میں گذری"۔ بہرکیف "طنز ومزاح کے جھروکے" سے باتیں بہت ہو گئیں۔ اب طوالتِ مضمون کے خدشے سے محض اکبر الہ آبادی کے چند طنزیہ اشعار پیش کرکے اپنی بات ختم کروں گا۔

گھر کی بیگم بانئے محفل بنے
مرد ورزن میں کیوں نہ پھر گاڑھی چھنے

o

پہونچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پرواہ نہ رہی!
کیک کو چکھ کے سوئیوں کا مزا بھول گئے

o

موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

o

تہذیب مغربی میں بوسے تلک معاف

اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات

o

شوق پیدا کر دیا بنگلے کا اور پتلون کا
نہ مثل ہے مفلسی میں آٹا گیلا کر دیا

o

خوب یہ پردہ نہ کرنے کا نتیجہ نکلا
جس کو سمجھا تھا بیٹا بھتیجہ نکلا

o

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا؟
بولیں کہ عقل پہ مردوں کی جا کے پڑ گیا

o

کسی پاکستانی شاعر نے جب اکبر الہ آبادی کی پوتیوں کو کراچی صدر میں بے پردہ گھومتے دیکھا تو کہا کہ :-

بے پردہ کل جو نظر آئیں اکبر کی پوتیاں
شاعر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا؟
بولیں کہ قبر پہ دادا کی جا کے پڑ گیا

امیر قزلباش

منظر ڈوبنے والا ہے
سورج ایک حوالا ہے
کاٹ رہا ہوں جسم کی قید
دروازے پر تالا ہے
تدبیر حق گوئی ہی نہیں
قسمت دیس نکالا ہے
دنیا در تک آئی تھی
کس مشکل سے ٹالا ہے
یہ گھر کب سے خالی تھا
ہر کمرے میں جالا ہے

امیر قزلباش

لہو لہو ہر منظر ہے
کس کے ہاتھ میں پتھر ہے

پہلا دن ہے بارش کا
پانی گھر کے اندر ہے

بیداری کے پتھر مار
دنیا خواب کا پیکر ہے

ہونٹ سئے بیٹھے ہیں لوگ
دل کے اندر محشر ہے

اس کی پیاس بجھائے گا
جیسے دشت سمندر ہے

مر جاتا ہے روز کوئی
میرا جینا دوبھر ہے

تاسیروں کی دھوپ میں جل
سن! اک لفظ مقدر ہے

وقت چرا لے جائے گا
یہ جو تبسم لب پر ہے

تجھ مجھ سے کیا کام اسے
وہ تو مست قلندر ہے

کشتی ہے، پتوار نہیں،
چاروں اور سمندر ہے

ہر دریا کے ساتھ امیرؔ
ایک یزیدی لشکر ہے

حیاتؔ لکھنوی

جب چاہو مٹا دو، یہ اجازت ہے ہماری
اِک بے در و دیوار عمارت ہے ہماری

احساس یہ رہتا ہے خدا جانے کہاں تک
آتے ہوئے لمحوں کو ضرورت ہے ہماری

جو غم بھی جہاں دیکھا، ہمیں اپنا لگا ہے
جس آنکھ میں آنسو ہے امانت ہے ہماری

وہ شہرِ طلسمات مبارک تمہیں یارو
یہ اُجڑی ہوئی بستی غنیمت ہے ہماری

پرچھائیں کسی کی بھی گوارا نہیں کرتے
آئینے میں محدود بصارت ہے ہماری

سیدہ شان معراج

کیسے کیسے دل نشیں خوابوں کے منظر لے گیا
میری آنکھوں سے کوئی نیندیں چرا کر لے گیا

چاندنی راتوں سے وابستہ تھیں بزم آرائیاں
چاند کیا ڈوبا کہ یادوں کا مقدر لے گیا

مدتوں سے ہیں اُڑانیں ایک ہی منظر میں قید
نوچ کر عجب سے وہ میری سوچ کے پر لے گیا

آج وہ یادوں کی دستاویز جھوٹی ہو گئی
کوئی اُس بستی کے نقشے سے مرا گھر لے گیا

آئینوں سے دور وصف آئینہ داری کو شان
لوگ کہتے ہیں کہ کوئی آئینہ گر لے گیا

سیدہ شان معراج

○

وسعتِ صحرا سے چھوٹے بام و در میں آ گئے
صبح کے بچھڑے مسافر شام گھر میں آ گئے

اول اول بیکراں تھیں آسماں کی وسعتیں
فاصلے پھر خود سمٹ کر بال و پر میں آ گئے

دل میں پوشیدہ رہے وہ رازِ سربستہ مگر
بے سلیقہ چند آنسو چشمِ تر میں آ گئے

رفتہ رفتہ رنگ لائے میرے سجدے لکے نشاں
عکس سارے پھر ابھر کر سنگِ در میں آ گئے

شاعری کا فن ادا جینے کی اور آدابِ غم
یہ ہنر بھی شانؔ دستِ بے ہنر میں آ گئے

مظفر ایرج

○

سیماب اثر، چاند بدن، پھول صدا ہوں — پارکھ ہو تو پرکھو مجھے میں کس کی ادا ہوں

کیا پوچھتے ہو مجھ سے مرا نامۂ اعمال — ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہوں

تو مجھ کو جھٹک، میری انا توڑ، مگر میں — سر تا بہ قدم تیرے لئے دستِ دعا ہوں

اب اور نہ کھولو میری تنہائی کے پیچاک — میں دستِ ہنرور کی طرح ٹوٹ چکا ہوں

ممکن ہے کوئی لہر بہا مجھ کو بھی لے جائے — میں صدیوں سے اُمید کے ساحل پہ کھڑا ہوں

کیا جانئے ہوں کس لئے زندہ اَزل سے — کیا جانئے کس کس کی عبادت کا صلا ہوں

پھر وحشت، سیہ دشت لکھا میرا مقدر — معبود! میں عاصی سہی، بندہ تو ترا ہوں

سچ بول کے کیوں زہر کا پیالہ پیا ایرج
اس بات پہ احباب سے معتوب ہوا ہوں

بلراج کمار

ہزار سرگوشیوں کے سائے میں کھیلتی کائنات گذرے
کبھی تو ایسا ہو سر پھری خوشبوؤں کے پہلو میں رات گذرے

مجھے یہ ڈر ہے کہ میری آواز کے جزیرے نہ ڈوب جائیں
ہمیشہ صحرا میں آہٹوں پر عجیب سے حادثات گذرے

کنواری معصوم خواہشیں ڈولیوں میں بیٹھی ہیں سج سجا کر
اُمید کی مہندیاں نہ اُتریں، نہ چاہتوں کی برات گذرے

میں تار تار تمہارے خوابوں کے پھول بکھرا کے چُن رہا ہوں
کسی بہانے تو نیند آئے، کسی بہانے تو رات گذرے

مرے گماں سے بھی آگے بلراج میری منزل قرار پائے
تلاش کا سلسلہ نہ ٹوٹے سفر سفر میں حیات گذرے

دریچہ زندگی ہے!

ذہن یادوں کا شجر
دردِ خود رو سی کوئی بیل کہ جو
غم اگاتی ہے، لہو چاٹتی ہے
وقت، بچپے کی کتاب
جس کے اوراق میں گم گشتہ
کوئی برگِ گلاب
اس نے رکھا ہو فراموشی میں
زندگی ایک دریچہ ہے
کہ اس پار کہیں
کوئی منظر ہی نہیں
وہ جو کہتا تھا کہ میں آؤں گا
دشت کی دھول ہوا
معبدوں میں وہی اِک شورشِ ناقوس و اذاں
کل میرے ہاتھ میں بھی پتھر تھا
آج سولی پہ بدن ہے میرا
رات جوگی نے کہا
روشنی وہم ہے، دِن جزیرہ تھا
کہ جو ڈوب گیا ——— ○

او۔ پی۔ شرما سارتھی

سیڑھی

میرے ہاتھ میں تیشہ ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ تیشے سے پہاڑ کھود کر کوئی جوئے شیر لایا تھا اور پھر اسی تیشے سے اپنا سر پھوڑ کر خودکشی کر لی تھی۔ لیکن مجھے یہ سب کچھ نہیں کرنا ہے۔ مجھے تو اس آدمی کا قتل کرنا ہے جو آئینے میں چھپا بیٹھا ہے۔ بس کئی دنوں سے اسے مارنے کے منصوبے باندھ رہا ہوں جس نے میرا چلنا پھرنا، کھانا پینا اور سونا جاگنا حرام کر رکھا ہے۔

اصل میں میں نے نہ کبھی آئینے کے بارے میں سوچا تھا اور نہ ہی کبھی تیشے یا قتل کے بارے میں۔ کیونکہ کچھ ہی مدت پہلے میں ایک عام ذہن و دانش کا آدمی تھا۔ اچھا بھلا دن کاٹ رہا تھا، آ جا رہا تھا، بول اور سُن رہا تھا۔ اس سب کے ساتھ میں ایک دھندا کر رہا تھا۔ یہ دھندا بہت آسان اور سب کی پسند کا تھا۔

میرا کام اس سیڑھی کے قریب جا کر کھڑے ہو جانا ہوتا تھا جس کے نیچے میری ہی طرز کے کچھ لوگ کھڑے رہتے تھے جن کا کام سیڑھی پر چڑھنے والوں کی مدد کرنا ہوتا تھا۔ چڑھنے والے کی حوصلہ افزائی کرنا ہوتا تھا۔ یہ لوگ چڑھنے والے کا بازو پکڑ کر سہارا دے کر اُوپر جانے میں اس کی مدد کرتے تھے۔ اسی سیڑھی کی اوپر کی جانب چند آدمی اوپر کھڑے چڑھنے والے کو روکنے کا نیک کام کرتے تھے اُسے منع کرتے تھے۔

انہوں نے چند قصے کہانیاں بھی رٹ رکھے تھے جو سنا کر چڑھنے والے کا لہو سکھا دیتے تھے اور اگر کوئی سب کچھ سن کر اوپر چڑھنے پر بضد ہو جاتا تو اسے ٹھیل بل اور دھو کے قریب سے نیچے کو دھکیلنا شروع کر دیتے تھے۔ اگر وہ شخص دھکیلا ہی نہ جا سکتا تو تیشہ یا تیشہ نما کوئی ہتھیار اس کے سر میں مار کر اسے نیچے کو لڑھکا دیتے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ آدمی زمین پر آ گرتا۔ کچھ دیر سسک کر اول تو وہ مر جاتا۔ اگر ہوش میں آ جائے تو چڑھنے کا ارادہ ترک کر کے کسی سمت بھاگ جاتا۔

اس تمام کارگزاری میں میرا حصہ بہت آسان اور مزہ دینے والا ہوتا تھا۔ میرا کام چڑھنے والے کی مدد کے ساتھ ساتھ اسے نیچے کو گھسیٹنا ہوتا۔ نیچے کو جھٹکا دینا ہوتا۔ چڑھنے والا میری وجہ سے کچھ تذبذب میں مبتلا بھی ہو جاتا۔ جب تک وہ مجھے اپنی مدد کرتے ہوئے پاتا تھا خوش رہتا تھا۔ لیکن جب اسے دوسرے رخ کا احساس ہوتا تو وہ اپنی ٹانگیں چھڑانے کی کوشش کرتا۔ ٹخنے آزاد کروانے کی سعی کرتا۔ پھر ہر جانب سے ناامید ہو کر وہ مجھے لاتیں مارنے لگتا۔ پاؤں سے پیٹنے لگتا۔ لیکن چونکہ میں دھندے والا آدمی تھا اور مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ جب تک نیچے کھڑے اور اوپر چڑھے لوگوں کا اشارہ نہ ملے میں پیٹتا چلا جاؤں۔ مار کھائے جاؤں۔ چڑھنے والے کی گالیوں کا زہر پیتا جاؤں۔ یہ سب برداشت کرتے ہوئے کبھی میں اوپر والوں کی جانب اور کبھی اپنے ساتھ کھڑے لوگوں کی جانب دیکھا کرتا تھا کہ کب اشارہ ملے۔ اشارے کا بری طرح انتظار کرنا میرے لئے کچھ تکلیف دہ ہوتا تھا۔ لیکن اشارہ ملتے ہی چڑھنے والے کی ٹانگیں اور پاؤں چھوڑ کر سرخرو ہو جاتا تھا اور مسکراتے ہوئے چڑھنے والے کا سر کے بل ایک کروٹ گرنے اور اس کے بھاگنے یا دم توڑنے کا انتظار کرتا تھا۔

ابتدا میں مجھے یہ دھندا کچھ عجیب لگا۔ سوچا کیا پیشہ ہے یہ؟ چھوڑ کر کچھ اور کروں۔ اسی خیال سے میں نئے دھندے کی تلاش میں نکلا۔ دربدر ہوا، خاک (۲)

چھانی۔ بستی کا کونہ کونہ چھان مارا۔ ہوا یہ کہ ہر جگہ ایک ہی دھندا رہ گیا تھا۔ سیڑھیوں کا دھندا۔ ہر جگہ سیڑھیاں، بےشمار سیڑھیاں، ہر جگہ سیڑھیوں کے نیچے بھی لوگ اور اوپر بھی لوگ۔ چڑھنے والے کی مدد کا ڈھونگ کرنے والے لوگ اور اوپر جانے کا ارادہ رکھنے والے کے سر میں تیشہ مار کر سر کے بل نیچے گرانے والے لوگ۔ ہر جگہ سیڑھیاں، ہر جگہ چڑھتے والے، ہر جگہ مدد کا فریب دینے والے، ہر جگہ نیچے گرانے والے ہر جگہ اوپر چڑھنے کے اشتہار بانٹنے والے۔

آخر۔ مجھے ایک جگہ ٹکنا پڑا۔ لیکن ٹھہرنے سے پہلے میں نے نیچے کھڑے لوگوں میں سے ایک آدمی سے پوچھا تھا۔ 'تم پہلے تو چڑھنے والوں کی مدد کرتے ہو۔ اور پھر اُسے نیچے کو گھسیٹنا شروع کر دیتے ہو۔ ایسا کیوں ہے؟'

'یہ ہماری روایت ہے، ہمارا ورثہ ہے، ہمارا یہ کردار ہے، اسی کی بنا پر تو ہمارا وجود قائم ہے۔'

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ میں عادی ہو گیا۔ عادی ہوتا گیا۔ دھندے کے ساتھ جُڑتا گیا۔ میں بھی وراثت والا ہو گیا۔ میں بھی روایت اور کردار والا ہو گیا۔ میں نے بھی اپنا وجود قائم کر لیا۔

شروع شروع میں مجھے اشتیاق تھا کہ میں اپنے دھندے میں مکمل طور پر رچ بس کر ماہر ہو جاؤں۔ میں چڑھنے والے کا قد و قامت دیکھتا۔ اس کا چہرہ، چہرے پر جھلکتا جنون دیکھتا، اس کے جسم کو چڑھنے کی خوشی میں تھرکتا اور تھرتھراتا ہوا دیکھتا۔ اور جب وہ سیڑھی پر پاؤں رکھتا تو میرے باطن کے کسی کونے سے اس کے تئیں ہمدردی کا احساس جاگنے لگتا۔ رحم بھی آتا۔ جی میں آتا کہ چڑھنے والے کو کہہ دوں سیڑھی پر پاؤں نہ رکھو تو بہتر ہے، جنون ترک کرو اور واپس چلے جاؤ۔ یہ نظر آنے والے مددگار فریب کے پیکر ہیں، یہ سراپا دھوکہ ہیں۔ تم ان اوپر پہنچے ہوئے

اور نیچے کھڑے لوگوں کے کردار، روایت، تہذیب اور وجود سے واقف نہیں ہو۔

لیکن میں کبھی یہ بات کسی سے کہہ نہ سکا۔ کہنے کی صورت میں میرا اپنا وجود مجھے خطرہ میں نظر آتا۔ رفتہ رفتہ میرے اور میرے باطن کے درمیان برف کی ایک بھاری چٹان ٹک گئی جس کے پگھلنے کا سوال کبھی پیدا ہی نہ ہوا۔ اور میں اپنے دھندے میں ترقی کرتا گیا۔

پھر میں نے خود کو نابینا تصور کر لیا۔ دیکھنا ہی ترک کر دیا بس سیڑھیوں میں پھنسے وجود کو مدد کا فریب دے کر نیچے کو گھسیٹنا، لاتیں برداشت کرنا، گھونسے اور گالیاں کھانا اور سننا۔ کچھ علم نہ ہوتا تھا کہ کون چڑھ رہا ہے، آدمی ہے، جانور ہے، بھوت ہے، آسیب ہے، روگی ہے، مسیحا ہے، احمق ہے، دانش ور ہے، اہلِ علم ہے یا ہنر مند۔؟ کون ہے؟

دن بھر میں دھندے میں مصروف رہتا۔ تھک بھی جاتا، کبھی کبھی دھندے کا حساب بھی رقم کرتا کہ کتنے جھٹکے دیئے، کتنی گالیاں کھائیں، کتنی مار اور ذلت برداشت کی۔ شاید ذلت کی مار، گالیاں اور تیور میرے وجود کے اقدار میں شامل ہو گئے تھے۔ اوروں کی طرح۔

کبھی کبھار میں سنتا تھا کہ چند لوگ بستی میں ایسے بھی ہیں جو اس ڈرامے کو جانتے ہیں اور محض تماشہ دیکھنے چلے آتے ہیں۔ لیکن ایسا کوئی بھی شخص میں نے کبھی دیکھا نہیں۔

اک صبح۔ پو پھٹنے پر ایسا ہی ایک شخص آدھمکا۔ مدد کرنے کا دعویٰ کرنے والے لوگ چلا رہے تھے۔ آؤ، سبھی آؤ۔ اپنا امتحان خود آپ لو۔ اپنی جرأت، اپنی ہمت اور حوصلے کو آزماؤ، سیڑھیاں چڑھو۔ سیڑھیاں چڑھنا انسان کی شاندار روایت ہے۔ اُوپر پہنچنا فطرت ہے۔ اور اگر اوپر نہ پہنچ سکو اور تیشہ کا زخم کھا کر نیچے لڑھک جاؤ یا بھاگ جاؤ۔ تو یہ تمہاری جانب سے ایک نئی انسانی

روایت کی شروعات ہوگی ــ آؤ!

وہ شخص سب کچھ سنتا رہا۔ لیکن سیڑھیوں کے قریب نہ آیا۔ سُن سُن کر مُسکراتا رہا۔ نیچے کھڑے لوگوں میں سے ایک شخص نے جس کے ہاتھ میں لوگوں کی ٹانگیں اور ٹخنے اور پاؤں کھینچ کھینچ اور گھسیٹ گھسیٹ کر کھردرے ہو چکے تھے اور جواب ہاتھوں کو چھپائے رکھتا تھا۔ اُس مسکراتے ہوئے شخص کے قریب گیا اور کہا ـــ "تم اپنی قسمت جاننا نہیں چاہتے؟ اپنی ہمت کو ناپنا نہیں چاہتے؟"

"میں کچھ نہیں کرنا چاہتا، صرف تماشہ دیکھنا چاہتا ہوں"۔ جواب ملا۔

"تم محض تماشہ ہی کیوں دیکھنا چاہتے ہو؟" کھردرے ہاتھوں والے نے پھر سوال کیا۔

"تماشہ دیکھنا ہماری روایت ہے، تہذیب ہے، ورثہ میں ملی ہوئی حس ہے۔ یک احساس کی ضرورت ہے اور تم دیکھو گے کہ تم تماشہ دھندے میں اور دھندے کے روپ میں دیکھتے ہو، اور میں فکر کی شکل میں"۔ جواب ملا۔

"تم کب تک یہ تماشہ دیکھتے رہو گے؟" ایک اور سوال مسکرانے والے آدمی سے ہوا۔

"تب تک، جب تک تمام لوگ محض تماشہ ہی دیکھنے والے نہیں بن جاتے"۔

مدد کرنے والا آدمی ہنسا ـــ "تمہارا خیال ہے کہ تمام لوگ سیڑھیوں پہ آنا اور چڑھنا بند کر دیں گے؟ یا تمام لوگوں کو دھندا ترک کرنا پڑے گا؟"

"تم ـــ؟ دھندا نہیں دھوکہ فریب، مکر اور بناوٹ نہیں چھوڑ دیتے اور لوگ فریب میں پھنسنا نہیں چھوڑ دیتے، تب تک میں مسکراتا اور تماشہ ......"

کھردرے ہاتھوں والے نے اس کی بات کاٹی ـــ "لوگ یہاں آنا، سیڑھیوں پر چڑھنے اور اوپر پہنچنے کی آرزو ترک کیسے کریں گے؟"

"آئینہ دیکھ کر"۔ تماشہ دیکھنے والے نے جواب دیا۔

"تم کوئی شیدائی معلوم ہوتے ہو" کہہ کر دھندے والا سیڑھیوں پر آگیا۔
اور تماشہ دیکھنے والا کسی طرف چلا گیا۔ لیکن اس کا لفظ "آئینہ" میرے ذہن میں
پرندے کی طرح پرواز کرتا رہا۔

دھندے سے فارغ ہو کر جب میں واپس لوٹ رہا تھا تو ایک موڑ مڑتے
ہی وہی شخص میرے سامنے تھا۔ وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔ میں کترا کر نکلنے ہی والا
تھا کہ اس نے روک کر سوال کیا ــــ "تم نے کبھی آئینہ دیکھا ہے؟"

"تمہارے پاس آئینہ ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں آئینوں کا دھندا کرتا ہوں۔ بناتا بھی ہوں اور بیچتا بھی ہوں"۔
اس نے جواب دیا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے ہمت بٹور
کر پوچھا ــــ "ایک شیشے کی قیمت کیا ہوگی؟"

اُس آدمی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ــــ "سبھی ڈرتے ہیں کہ معلوم نہیں کیا
قیمت ادا کرنی پڑے۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ قیمت کچھ بھی نہیں، صرف خوف کو ترک کرنا
ہے۔ بس"۔

"تو ایک آئینہ مجھے بھی درکار ہے۔ میں بھی آئینہ دیکھنا چاہتا ہوں"۔ میں نے کہا۔

"دے سکتا ہوں، معمولی سی شرط ہے"۔

اس کی بات سن کر میں پھر گھبراہٹ اور شبہ میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"سنا دو۔ شرط بھی سنا دو"۔

"اگر آئینے میں سے کچھ دکھائی دے تو تمہیں اپنا دھندا ترک کر کے آئینے،
آئینے بیچنے ہوں گے۔ اور اگر کچھ بھی دکھائی نہ دیا تو آئینہ لوٹا دینا ہوگا" اس نے کہا۔

میں شرط تسلیم کر کے آئینہ لے آیا۔ میرا باطن سخت کشمکش میں تھا۔ میرا

ذہن نشیب و فراز میں جھول رہا تھا۔ اس پر سخت بیقراری تھی کہ کب آئینہ کسی دیوار پر نصب کروں اور کب دیکھوں۔

میں نے جلدی جلدی آکر، اپنے کمرے کی ایک دیوار پر آئینہ لگایا اور اس کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ دفعتاً میری چیخ نکل گئی۔ آئینے میں، میں نہیں تھا، کوئی ڈراونا خونخوار نما بن مانس تھا۔ مجھے قطعاً یقین نہیں آرہا تھا کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں اور کیا یہ حقیقت بھی ہو سکتی ہے۔ میں آئینے سے ہٹ گیا۔ پھر سوال ذہن میں پیدا ہوا کہ میں نے کیا دیکھا ہے۔ میں پھر آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پھر وہی سینگوں والا دیو، بھیانک صورت والا۔ ٹھوڑی سے نیچے تک آتے ہوئے دانتوں والا۔ لیکن اس بار اس کے خوف کا تاثر کچھ کم تھا۔ اس خیال سے کہ شیشے میں سے نکل کر یہ بھیانک دیو کیسے باہر آسکتا ہے اور میرا کیا بگاڑ سکتا ہے؟

رفتہ رفتہ میں آئینے کے بارے میں شدت سے سوچنے لگا۔ دھندے سے فارغ ہو کر لگاتار دیکھنے لگا۔ اور پھر لگاتار ایک تبدیلی، جس کی رفتار بہت مدھم تھی، محسوس کرنے لگا۔

اب تبدیلی بہت عجیب تھی۔ ڈراؤنے دیو کے بدلے کچھ اور روپ دکھائی دینے لگتا۔ کبھی سانپ نما آدمی، کبھی آدمی نما سانپ۔ کبھی بہت تیزی سے خوفناک چہرے بدلتا ہوا بہروپیا — کبھی مٹی کے ڈھیر سا انسان۔ کبھی ریت کا گھر، کبھی آدمی نما ننگا درخت، کبھی ننگے درخت نما آدمی۔

کبھی کوئی جوغے والا پُراسرار درویش اور کبھی کوئی بھکاری۔ اور کبھی کوئی انگ انگ سے رِستی پیپ والا کوڑھی۔ ہاتھ سکیڑتا اور پھیلاتا ہوا —!

پھر — دیکھنے کی ایک لمبی مسافت کے بعد ایک تصویر مسلسل دکھائی دینے لگی۔ ایک آدمی، بے سر آدمی، اس کا صرف دھڑ تھا اور وہ ہاتھ پاؤں مارتا

دکھائی دیتا تھا۔

آہستہ آہستہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ دھڑ میرا ہے۔ میں ہی ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔ میں ہی کچھ چاہتا ہوں لیکن پھر حیرانگی کا عالم طاری ہو جاتا کہ میرے دھڑ پر تو سر ہے۔ اس کا سر کہاں ہے؟

جب بہت دنوں تک اس کا سر مجھے نظر نہ آیا تو میں نے ارادہ کر لیا کہ آئینہ توڑ دوں۔ کمرچولسا میں بدل کر کمرے سے باہر پھینک دوں۔ پھینک دوں گا۔

میں نے تیشہ بنانا شروع کر دیا۔ اس کو آب دیتے ہوئے، دھار لگاتے ہوئے میں سوچوں کے حصار میں گھر جاتا۔ آئینے کا رشتہ باطن میں جاگ اٹھتا۔ اس کے کرشمے آنکھوں کے آگے گھومنے لگتے۔ پھر میں سوچتا کہ چند دن اور انتظار کرنا چاہیے۔ شاید آئینے والے آدمی کے دھڑ پر سر اگ آئے۔ وہ آدمی مجھے مکمل نظر آئے اور میں اپنا دھندا ترک کر کے آئینوں کا دھندا شروع کر دوں۔

لیکن ایک دن میری برداشت کا باندھ ٹوٹ گیا۔ میں نے آخری بار اس دھڑ کو دیکھ کر آئینے کو توڑنے کا ارادہ پختہ کیا۔ تیشہ اٹھایا۔ تیشہ آئینے سے ٹکرانے کو ہوا کہ کسی نے پشت سے میرا بازو پکڑ لیا۔ "کیا کر رہے ہو؟"۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ آئینوں کا تاجر کھڑا تھا۔

"تم نے کیا کر دیا ہوتا اگر میں نہ آتا؟" اُس نے میرے ہاتھ سے تیشہ لیکر ایک طرف پھینک دیا۔ "آئینہ دیکھ کر توڑنا چاہیے"۔ اُس نے کہا۔

"دیکھنے کے بعد ہی توڑ رہا تھا"۔ میں نے کہا۔

"تم نے نہیں دیکھا۔ پھر دیکھو"۔ اُس نے کہا

اب ایک کرشمہ ہوا۔ آئینے میں ایک مکمل آدمی کھڑا تھا سر سمیت۔

میرا دھندہ اب بدل چکا ہے۔ اب میں سیڑھیوں کے پاس جاتا ہوں اور با آواز بلند لوگوں سے کہتا ہوں۔ "آئینہ دیکھنا بھی ہماری روایت ہے، کردار ہے، ہمارا ورثہ ہے، آئینہ دیکھو تو محسوس کرو گے کہ تم سیڑھیاں چڑھ چکے ہو۔ آئینہ دیکھو" ——— ○

محمد بشیر مالیر کوٹلوی

گؤ ہتیہ

پُرزور نعروں سے پورے ماحول پر ایک خوف سا طاری ہو چلا تھا۔ لوگوں نے خود کو اپنے اپنے گھروں میں محفوظ کر لیا۔ دکاندار اور خوانچے والے اپنا اپنا مال سمیٹنے میں جٹ گئے۔ مگر اشتعال جلوس' تیز آندھی کی طرح بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں لاٹھی تھی تو کسی کے ہاتھ میں بلم۔ کوئی تلوار لئے ہوئے تھا تو کوئی گنڈاسا۔ سب کے سر پر خون سوار تھا۔ آگے آگے چلتے ہوئے پجاری چلایا۔

"گؤ ماتا کی !!!"

"جے ہو !!! ——— جے ہو !!!"

"گؤ ہتیہ !!!"

"بند کرو !!! ——— بند کرو !!!"

چلتے چلتے سارا ہجوم شہر کے ایک مشہور صنعت کار اقتدار کے فلیٹ کے سامنے رک گیا۔ پجاری دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر چلایا۔

"بھائیو !! ——— یہ ہے اس گنڈے کا گھر' ماں قسم ! ——— میں نے اپنی آنکھوں سے یہاں

گستاخیتہ ہوتی دیکھی ہے۔ یہ حرام جادہ! ـــــ مسلمانوں کو گئو ماس سوگات میں دیتا ہے اور ہمارے خلاف پلان بناتا ہے۔ ارے! ـــــ میں کہتا ہوں اگر کوئی تمہاری ماں کو تمہارے سامنے مار ڈالے، کیا تم! ـــــ کیا تم دیکھتے رہو گے!!!؟

فلیٹ کے دروازے اور کھڑکیاں بند ہونے لگیں۔ بھیڑ میں سے ایک نوجوان چیخا۔

"ہم اس کا سروناش کر دینگے۔ اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اس گھر کی!!!"

پھر چیختی آوازوں کا شور چاروں طرف پھیل گیا "مارو!! ـــــ جلادو!!! ـــــ ختم کر ڈالو"!!

اچانک پہلی منزل کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا اور بندوق کی نال نمودار ہوئی۔ ایک دھماکہ ہوا۔ جنواری کے قریب کھڑا ہوا ادھیڑ عمر کا آدمی ایک دل دوز چیخ مار کر اوندھے مونہہ گر پڑا۔ اور دم توڑ گیا۔ گولی اس کی کنپٹی پر لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ بندوق دوسری بار مزید ایک شعلہ اگلتی لوگ مرنے والے کو روندتے ہوئے دروازہ توڑ کر فلیٹ میں گھس گئے۔ ہر طرف چیخ و پکار بلند ہو گئی۔ گھر کے مکینوں کو کاٹ کاٹ کر چاروں طرف بکھیر دیا گیا۔ سرخ سرخ خون کا سیلاب امڈ پڑا۔ قیامت بپا کرنے کے بعد ایک ایک کر کے سبھی بلوائی چلے گئے۔

جنواری، پاگلوں کی طرح ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھس رہا تھا۔ وہ کچھ تلاش کر رہا تھا۔ امتیاز کے کمرے کی تلاشی کے بعد اس نے اس کی پوشیدہ تجوری کو ڈھونڈھ نکالا۔ تھوڑی ہی جدوجہد کے بعد وہ تجوری توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ بدحواسی کے سے عالم میں وہ ایک ایک کاغذ نکال کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے پڑھتا اور پھینک دیتا۔ ایک اسٹام پیپر دیکھ کر وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے جیب سے ماچس نکالی اور پیپر کو آگ لگا دی۔ ایک وحشیانہ قہقہہ لگا کر وہ پیپر کی راکھ کو امتیاز کی چار حصوں میں بٹی ہوئی لاش پر پھینک کر بولا۔

"امتیاز! ـــــ لے یہ رہا رہن نامہ جس کے بل بوتے تو نے مجھے بھکاری بنانے کی دھمکی دی تھی! ـــــ اب میری فیکٹری اور میرا فلیٹ میرے ہی ہوئے ـــــ آہا ہا ـــــ ہا!!!"

میری نظر میں

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

○ ——— محمد حسین آزاد

——— نند کشور وکرم

ضمانت ——— ۸۰ صفحات ($\frac{۱۸\times۲۲}{۸}$)

قیمت ——— ۵ روپے

پبلشرز ——— ترقی اردو بیورو نئی دہلی

زیر نظر کتابچہ اُس کتابی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو سلسلہ بیورو نے اردو کے مقتدر ادیبوں کو عوام سے روشناس کرنے کے سلسلے میں شروع کیا ہے۔ اس ضمن میں کچھ کتابیں پہلے ہی شایع کی جا چکی ہیں۔ کتاب کا سرورق خوبصورت ہے۔ جس پر آزادؔ کی کلاسیکی تصویر چھاپی گئی ہے۔

نند کشور وکرم نے اس کتابچے میں بڑے سلجھے ہوئے اور پُر معنی انداز میں آزادؔ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ اور کسی قسم کی بے جا طوالت کے بغیر آزادؔ کی زندگی کی کہانی کو صفحہ قرطاس پر بکھیر لیا ہے۔ آزادؔ کی زندگی کے بارے میں کتابچہ کچھ ایسی باتوں کا بھی احاطہ کرتا ہے جن کا تذکرہ دوسری کتابوں میں نہیں ہوا ہے۔ وکرمؔ بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں توازن کو اوّلیت حاصل رہی ہے۔ یہ توازن وکرم نے زیر نظر کتاب میں بھی برقرار رکھا ہے۔

زندگی کی کہانی کو دہرانے کے علاوہ فاضل مصنّف نے آزاد کی مختلف تصانیف پر بہت ہی پُر معنی

انداز میں بحث کی ہے۔ آزاد نثر نگار ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ کتاب کے خاتمے پر اُن کی شاعری کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔ اسطرح سے ہمیں کچھ ایسی چیزیں پڑھنے کو ملی ہیں جو کبھی کتابوں کا حصہ تھیں مگر اب ڈھونڈنے پر بھی دستیاب نہیں ہوتیں۔

کتاب کے آخر میں "کتابیات" کے باب نے اس کتابچے کی افادیت کو دوبالا کر دیا ہے۔ اس قسم کی کتابیں شایع کرنا بیورو کا ایک مستحسن قدم ہے اور ہر لحاظ سے قابل ستایش ہے۔ ہاں اس کتابی سلسلے میں اردو کے ان علاقائی ادیبوں کو جگہ ملنی چاہیئے جنھوں نے اردو دنیا میں اپنی حیثیت منوالی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کتاب کو ملک کی تمام سرکاری اور غیر سرکاری لائبریریوں میں جگہ ملنی چاہیئے۔

آرٹ کی کہانی

سیما پرویز

قیمت ـــــ ۳.۲۵ روپے

حجم ـــــ ۶۴ صفحات (۲۲×۱۸/۸)

ناشر ـــــ ترقی اردو بیورو نئی دہلی

مصوری کو اظہار کا آئینہ خانہ کہا جاتا ہے۔ فنون لطیفہ میں آرٹ کی مسلّمہ حیثیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں جو تقدس مصوری کے مختلف پہلوؤں کو حاصل رہا ہے اس کا آج بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ تانتروں میں تو مصوّری کو حرف اوّل کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ پر قایم ہے کہ ہمارے عوام ابھی تک مصوّری کی لطافتوں اور نزاکتوں سے لطف اندوز ہونے کے اہل نہیں ہو پائے ہیں۔ سیما پرویز کی زیر نظر کتاب اس ضمن میں اپنی نوعیت کی اچھی کوشش ہے۔ کتاب میں مغرب میں مصوری کے مختلف ادوار سے بحث کی گئی ہے اور ہلکے پھلکے انداز میں مصوری کی خصوصیات کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ عام قاری اس کتاب

کو پڑھ کر مصوری کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جان سکتا ہے۔ مگر کتاب کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ابھی تک ہم لوگ احساس کمتری سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ ہمیں مغرب کی ہر چیز بھلی معلوم ہوتی ہے مگر اپنے شاہکار نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ سیما پرویز نے مغرب میں مصوری کے سفر کو تو دھیان میں رکھا ہے مگر انکی نظر اپنے ملک کی اور نہیں اٹھی ہے۔ اپنے ملک میں دیواری تصاویر مجسموں اور مورتی کلا کی ایسی روایت موجود ہے جسنے ساری دنیا کو داد دینے پر مجبور کیا ہے مگر کیا کریں ہمارے اپنے لوگوں کو اپنی چیزیں پسند نہیں آتیں۔ اس بات کو یا تو لاعلمی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ورنہ ایک جانی بوجھی کوشش سے ___ محض دوسروں کے سہارے جینا ایک آزاد ملک کے شہریوں کو زیب نہیں دیتا۔

کتاب کا طرز تحریر بھی کچھ گنجلک سا ہے۔ کئی مقامات پر تذکیر و تانیث کی غلطیاں موجود ہیں۔ چند ایک مثالیں حاضر ہیں :-

"اس زمانے میں لوگ ان علامتوں سے لوگ واقف ہوتے تھے" (ص-۲۳)۔ "اب رنگوں میں تیل ملا کر تیار کرتے ہیں" (ص-۲۹)

"نشاۃ ثانیہ سے پہلے جب عیسائیوں کی ابتدا ہوئی تھی" (ص-۱۵) کتاب میں میسوپوٹامیہ کو میسوپوٹامیا لکھا گیا ہے۔

مجھے توقع ہے کہ بیورو کے ارباب اختیار آئندہ اس طرف توجہ دینگے۔ مختلف فنون کے بارے میں بیورو کی کوششوں کو زیادہ وسعت ملنی چاہیے تاکہ لوگوں کی جانکاری میں اضافہ ہوتا رہے کچھ کوتاہیوں کے باوجود بھی یہ کتاب قابل توجہ ہے۔ کتاب کی کتابت اور طباعت بیورو کے ارباب اختیار کے اعلیٰ ذوق کی نشاندہی کرتی ہے۔

○ ——— ٹرانسسٹر کے بنیادی اصول

——— سید اقبال حسین رضوی

حجم ——— ۱۲۸ صفحات ($\frac{22 \times 18}{8}$)

قیمت ——— ۲۵-۱۱ روپے

پبلشرز ——— ترقی اردو بیورو نئی دہلی

کسی زبان کو بھی ایک باوقار زبان کا رتبہ ملتا ہے جب اسمیں سائنس ٹکنالوجی، نفسیات، سماجیات، عمرانیات وغیرہ جیسے مضامین کو ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے اور یہ ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کی محتمل ہو سکے۔ شعر اور نثر کی زبان من کو ضرور لبھا سکتی ہے مگر جدید دور کے تقاضوں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اردو بیورو کی کوششوں سے اردو اب ایک علمی زبان بنتی، اور رواں دواں نظر آتی ہے۔ ترقی اردو بیورو کی شایع کردہ کتابیں اس ضمن میں خاصی اہم ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی اسی نوع کی کتابوں کے زمرے میں آتی ہے۔

فاضل مصنف نے کتاب میں ٹرانسسٹر کے موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اسکی افادیت کے متعدد پہلو بیان کئے ہیں۔ ٹرانسسٹر، جو کہ ایک جدید ترین دریافت ہے اور جسکی بدولت برقیات کے میدان میں ایک انقلاب پیدا ہوا ہے، سے جانکاری حاصل کرنا آجکل کے خلائی دور میں ضروری ہے۔ یہ ٹرانسسٹر ہی ہے جسنے انسان کو خلاؤں میں گھومنے پھرنے کی صلاحیت بخشی ہے۔ اس مختصر سے کتابچے کی اشاعت کیلئے مصنف اور ناشر دونوں مبارک بادی کے مستحق ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ بیورو اس قسم کی کتابیں شایع کرنے کا سلسلہ جاری رکھیگا تاکہ اردو شناس سائنس کی برق رفتار ترقی کے دور میں ناآشنائی کا شکار نہ ہوں۔

اس کتاب کو ملک کی لائبریریوں میں جگہ دینے کی پُرزور سفارش کی جاتی ہے۔ کتاب کی طباعت اور کتابت معیار کے مطابق ہے اور گیٹ اپ بھی دیدہ زیب ہے۔ زبردست مہنگائی کے اس دور میں کتاب کی قیمت مقابلتاً کم ہے۔

○ ——— موتی لال ساقی

اکادمی کی سرگرمیاں

کلچرل اکیڈیمی کے زیر اہتمام ۸ جنوری ۱۹۸۵ء کو موقع دوڈار ضلع کٹھوعہ میں ایک روزہ کلچرل پروگرام پیش کیا گیا جس میں لوک موسیقاروں کی تین پارٹیوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں جموں ڈویژن کے کونے کونے سے آئے ہوئے ۲۵ ممتاز گوجری شعراء نے حصہ لیا۔

یاد رہے کہ ۸ جنوری کو دوڈار میں بابا عمرالدین سوہدن کا سہ روزہ عرس مبارک شروع ہوا جس میں ضلع کٹھوعہ اور پنجاب کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تین ہزار سے زائد لوگوں نے شرکت کی اور اکادمی کے پروگرام سے محظوظ ہوئے۔

○

۸ جنوری ۸۵ء کو ہی جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کے زیر اہتمام اکادمی کے دفتر واقع لال منڈی سری نگر میں ایک محفلِ افسانہ کا انعقاد ہوا جس میں جناب اوتار کرشن رہبر، غلام حسن تسکین، جناب غلام نبی بابا اور جناب فاروق مسعودی نے اپنے افسانے پڑھے۔ محفل میں مدعو افسانہ نگاروں کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی افسانوں پر ہوئی بحث میں حصہ لیا۔ محفل دیر تک جاری رہی۔ اس محفل کی صدارت کے فرائض کشمیری کا افسانہ نگار ڈاکٹر رتن لال شانت نے انجام دئے۔

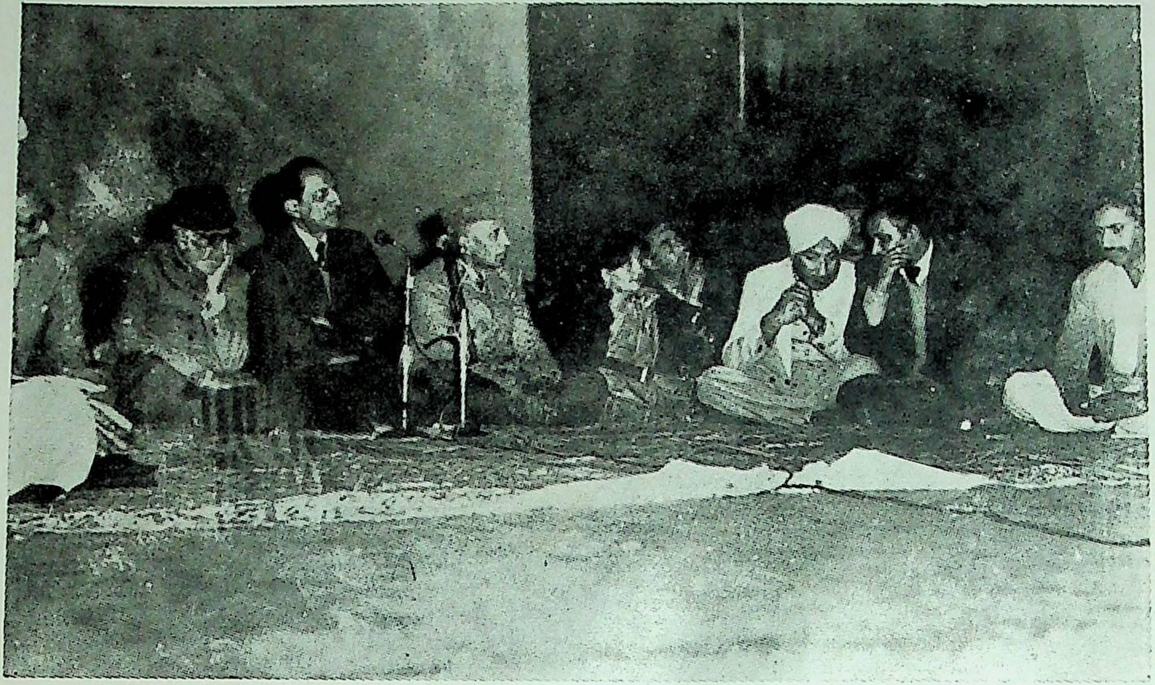

کُل ہند اُردو مُشاعرہ جموں — ایک منظر

سامعین میں وزیرِ تعلیم جناب علی محمد نایک اور چودھری محمد اسلم بھی موجود ہیں۔

○

۱۴ر جنوری ۱۹۸۵ء کو دلنہ (بارہمولہ) میں اکیڈیمی کی طرف سے ایک محفلِ مشاعرہ منعقد کی گئی جس میں ضلع بارہمولہ کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے شعراء نے شرکت کی۔

۱۵ر جنوری کو کریری پٹن میں بھی ایک محفلِ مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں علاقہ بھر کے شعراء نے شرکت کی۔

○

جنوری میں وادیٔ کشمیر میں اچھی خاصی سردی ہوتی ہے لیکن اس سال موسم کچھ کچھ خوشگوار رہا۔ ۱۶ر جنوری کو اکیڈیمی کے صوبائی دفتر کی طرف سے ایک محفلِ شعر کا اہتمام کیا گیا جس میں وادی کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے پندرہ شعراء نے شرکت کی اور مدعو سامعین کے سامنے اپنا کلام پیش کیا۔ یہ محفلِ شعر شام گئے تک جاری رہی اور حاضرین شعراء کے کلام سے محظوظ ہوتے رہے۔

○

جنوری کی ۱۷ تاریخ کو ٹیگور ہال میں وادی کے نامور داستان گو محمد اسماعیل میر کی آواز میں مشہور لوک داستان 'ہی مال ناگرائے' اکیڈیمی نے عمداً بند کرائی۔ اس کے علاوہ محمد عبداللہ ڈار جو کہ صحرائی موسیقی کے لئے مشہور ہیں، کی ریکارڈنگ بھی اسی روز ٹیگور ہال میں کی گئی۔ اکیڈیمی نے لوک مضنوں اور دوسری لوک مضنوں کی عمدابندی کا کام بھی ہاتھ میں لے رکھا ہے اور اس سلسلے میں اب تک مختلف علاقوں میں کام کیا جا چکا ہے۔

○

یوم جمہوریہ کی تقریبات کے سلسلے میں ہماچل پردیش میں شملہ کے

مقام پر ایک شاندار تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں مقامی لوک رقاصوں کی مختلف ٹولیوں کے علاوہ پنجاب، ہریانہ اور جموں کے ثقافتی وفود کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

اس سلسلے میں کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے ہنسی لوک رقاصوں پر مشتمل ایک پارٹی ۲۳ جنوری کو جموں سے شملہ کے لئے روانہ ہوئی جہاں اس نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ جموں کے رقص کو ناظرین نے بے حد پسند کیا۔ اس کی سراہنا کرتے ہوئے مرکزی وزیر مملکت برائے صنعت جناب عارف محمد خان نے امید ظاہر کی کہ شملہ میں آئندہ بھی اس طرح کے ثقافتی جشن منعقد ہوتے رہیں گے۔ انہوں نے جموں کے ثقافتی وفد کو حکومت ہماچل پردیش کی طرف سے ایک شاندار ٹرافی عطا کی۔ یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ حکومت ہماچل پردیش پچھلے کئی سال سے یوم جمہوریہ کی تقریبات کے موقعہ پر اس طرح کے پروگرام منعقد کرتی چلی آئی ہے اور پچھلے سال بھی اکیڈیمی کے ایک ثقافتی وفد نے ان تقریبات میں شرکت کی تھی۔

O

یوم جمہوریہ تقریبات کے سلسلے میں اکادمی کی طرف سے وادی میں کئی تقریبات منعقد کی گئیں۔ ۲۴ جنوری کو بیجبہاڑہ (اننت ناگ) میں ایک محفل مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں مقامی شعراء نے شرکت کی۔

O

۲۶ جنوری کو رقص و سنگیت کی ایک محفل ٹیگور ہال میں منعقد کی گئی جس میں حسینہ اختر نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا

۲۸ جنوری کو کلوسہ باندی پورہ میں بھگت تھیٹر کے فنکاروں نے

"منٹہ لیچہ پانسرہ" نامی کشمیری ڈرامہ پیش کیا جسے مقامی آبادی کے علاوہ دور دراز سے آئے ہوئے سینکڑوں لوگوں نے بھی دیکھا۔ لوک فنکاروں کی یہ پیش کش لوگوں کو کافی پسند آئی۔

○

۲۸ جنوری ۸۵ء کو بھی ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے زیر اہتمام ابھنو تھیٹر جموں میں ایک کل ہند محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے سربرآوردہ شعراء کے علاوہ ریاست کے کئی نامور شعراء نے بھی حصہ لیا۔ محفل مشاعرہ کی صدارت قانون ساز کونسل کے چیئرمین جناب موہن کشن تکو نے کی اور صف سامعین میں دوسرے معززین کے علاوہ ریاست کے وزیر تعلیم جناب علی محمد نایک بھی موجود تھے اور مشاعرہ رات گئے تک جاری رہا۔

صاحب صدر نے اپنی تقریر میں اکیڈیمی کی کارکردگی کی سراہنا کرتے ہوئے کہا کہ اکاڈمی ریاست میں بولی جانے والی مختلف زبانوں کی ترقی و ترویج کے لئے جو کام کر رہی ہے اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انہوں نے خاص طور پر اکاڈمی کے اس رول کو بھی سراہا جو وہ ریاست میں اردو کو فروغ دینے کے سلسلے میں ادا کر رہی ہے۔ جناب تکو نے کہا کہ شاعر سماج کی آنکھ ہوتا ہے اور جو دکھ درد اسے اپنے اردگرد محسوس ہوتے ہیں وہ انہیں زبان دیتا ہے۔ آج کل کے حالات میں شعراء پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ اپنے سماج کو صحت مند لائنوں پر تعمیر کرنے میں ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔

جن شعراء نے محفل مشاعرہ میں شرکت کی ان کے اسمائے گرامی ہیں:۔

راجکمار چندن، بلراج کمار، رفیق راز، سلطان الحق شہیدی، مظفر ایرج، محمد یسین بیگ، پرتپال سنگھ بیتاب، عابد مناوری، سیدہ شان معراج، حیات لکھنوی

میکش کشمیری، قیصر قلندر، مظہر امام، راج نرائن راز، مخمور سعیدی، جگن ناتھ آزاد، امیر قزلباش اور میر غلام رسول نازکی۔

اس مشاعرے میں اور بھی کئی شعراء کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی جن میں سے کچھ نے تو قبولیت نامے بھی بھیج دئے تھے لیکن وہ مقررہ تاریخ پر نہیں آسکے۔

٥

ریاستی اکادمی بیک وقت ساہتیہ، سنگیت ناٹک اور للت کلا اکیڈمی کا کام کر رہی ہے۔ جس طرح مختلف زبانوں کے ادیبوں کو ان کی تخلیقات شائع کرنے کے لئے مالی امداد دی جاتی ہے اسی طرح مصوروں کو بھی اپنی تصاویر کی نمائش کے لئے امداد دی جاتی ہے۔ چنانچہ اکادمی نے سال رواں میں کئی مصوروں اور مصوری سے وابستہ اداروں کے حق میں تصویروں کی نمائش کے لئے مالی امداد منظور کی تاکہ وہ ریاست اور بیرون ریاست ان نمائشوں کا اہتمام کرسکیں۔ جن اداروں یا مصوروں کے حق میں مالی امداد منظور کی گئی، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

(۱) نیاز احمد سرینگر -/۴۵۰ روپے۔ نمائش: سرینگر۔ یکم اکتوبر تا ۷ اکتوبر ۶۸۴

(۲) مسز اوم کھجوریہ، جموں -/۶۵۰ روپے۔ نمائش: جموں، ۱۵، ۱۶ دسمبر ۶۸۴

(۳) سیکریٹری انڈو جولز جموں -/۷۰۰ روپے۔ کل ہند نمائش: جموں ۱۵ تا ۲۱ جنوری ۶۸۵
اس کے علاوہ انہیں سات دن کے لئے آرٹ گیلری بھی بغیر کسی کرایہ کے دی گئی۔

(۴) پنچشیل کول سرینگر -/۸۵۰ روپے۔ نمائش: جموں ۲۳ تا ۲۵ جنوری ۶۸۵

٥ —— (ادارہ)